


بابری مسجد

تالیف

مولانا محمد عثمان معروفی کرتھی جعفرپور اعظم گڑھ یوپی



الحمد
تالیف
مولانا محمد عثمان معروفی اعظم گڈھ (یوپی)
قیمت :- پانچ روپیے

فہرست

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ——— نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

ظاہر میں مرے حال کو سرسبز نہ جانو — پوشیدہ جگر پھٹتا ہوں مانند حنا کے

مرحوم بابری مسجد اجودھیا کے بارے میں اس کتابچہ کے اندر مسلم و غیر مسلم لوگوں کے ایسے مستند بیانات و مقالات درج کئے گئے ہیں جن سے مسجد کی صحیح تاریخی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط اور مضحکہ خیز بن جاتا ہے کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اس کے کھنڈر پر یہ مسجد بنائی، یہ بابر کی تعمیر کردہ مسجد ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ بابر کا اجودھیا میں آنا ہی ثابت نہیں۔ بابری مسجد کی تعمیر کا سبب یہ ہوا کہ شہنشاہ بابر نے ابراہیم لودھی کو ۱۵۲۶ء ۹۳۲ھ میں شکست دے کر تخت دہلی پر قبضہ اور مغلیہ حکومت قائم کیا، بابر ۱۵۳۰ء ۹۳۷ھ تک حکمراں رہا۔ ۱۵۲۸ء ۹۳۵ھ میں اودھ کے گورنر شیخ بایزید نے بغاوت کر دی، بابر نے اودھ آکر اس کی بغاوت فرو کی اور اس کی جگہ میر محمد باقی اصفہانی کو گورنر مقرر کر کے چلا گیا۔ اس یادگار میں میر باقی نے ۱۵۲۸ء ۹۳۵ھ میں ایک خالی زمین پر بابری مسجد بنوائی۔ انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو والی پالیسی سے اس مسجد میں جھگڑا اس طرح کھڑا کیا کہ نواب واجد علی کے زمانہ میں ایک بدھشٹ نجومی سے اپنی خواہش کے مطابق ایک زائچہ تیار کرایا، اس طرح نجومی نے بابری مسجد کے احاطہ میں رام جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر متعین کیا پھر انگریزوں نے کچھ بنیاد پرست ہندوؤں کو آمادہ کیا کہ ان دونوں مقامات کو حاصل کریں۔ نواب واجد علی کا وزیر علی نقی خاں

نیمی انگریزوں کا وفادار، رشوت خور شخص تھا اس نے واجد علی شاہ کو اس
پر آمادہ کر لیا چنانچہ مسجد سے باہر لیکن مسجد ہی کے احاطہ کے اندر سیتا
رسوئی اور جنم استھان کیلئے ۲۱ × ۱۷ فیٹ جگہ دیدی گئی جس پر نیا چبوترہ
بنایا گیا اس کے بعد تو یہ ظلم ہوا کہ چبوترہ کو چھوڑ کر اصل مسجد ہی کو رام جنم استھان
کہا جانے لگا۔ ۱۹ رجنوری ۱۸۸۵ء کو مہنت رگھوبر داس نے اس
چبوترہ پر مندر بنانے کیلئے دعویٰ دائر کیا مگر ہار گیا تو پھر ۲۴ ردسمبر ۱۸۸۵ء کو
اس کی اپیل کی وہ بھی ۲۶ رمارچ ۱۸۸۶ء کو خارج ہو گئی۔ آزادی کے
بعد ۲۲ ردسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں چوری سے کچھ شر پسند ہندوؤں نے کلکٹر نایر
کی سازش سے مسجد کے اندر رام چندر کی مورتی رکھدی اس کے بعد دفعہ ۱۴۵
کے تحت مسجد کو قرق کر کے اس پر سرکاری تالا لگا دیا گیا اور جب مسجد میں لگاتار
۴۲۴ برس ہجری حساب سے اور ۴۲۱ برس عیسوی حساب سے امام و مؤذن کی تعیین
کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جاتی رہی اسے مسلمان بے دخل کر دیئے گئے
پھر ۱۶ رجنوری ۱۹۵۰ء سے مقدمات کا سلسلہ شروع ہوا، بعد میں فیض آباد
عدالت سے مقدمہ ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ میں پہونچا، اس طویل عرصہ میں
مسلمانوں کے بار بار تقاضے کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا، ابھی مقدمہ
ہائی کورٹ میں موجود ہے کہ ۲۵ رجنوری ۱۹۸۶ء کو رمیش چندر پانڈے
نے جو اس مقدمہ میں کبھی فریق نہیں رہا منصف صدر فیض آباد کے یہاں
درخواست دی کہ رام جنم بھومی میں ہم کو پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے مگر
منصف نے یہ درخواست رد کر دی تو رمیش چندر نے ۳۰ رجنوری کو ڈسٹرکٹ

جج مسٹر کے، ایم پانڈے کے یہاں اپیل کی جو قبول کرلی گئی، اس سلسلہ میں مسلمانوں کی درخواست خارج کردی گئی، یکم فروری ۱۹۸۶ء کو یکطرفہ فیصلہ کردیا گیا اور اسی دن سنیچر کو ۵ بجکر ۱۹ منٹ پر تالا کھولکر پوجا پاٹ کرنے کیلئے مسجد ہندوؤں کے حوالہ کردی گئی۔ ہندوؤں نے خوشی میں چراغاں کیا، مٹھائیاں تقسیم کیں، مسلمانوں نے غم وغصہ میں سیاہ جھنڈے اور کالی پٹیاں لگائیں اور ۱۴ فروری ۱۹۸۶ء کو پورے ہندوستان میں یوم سیاہ منایا۔ ملک کے بہت سے مقامات پر فسادات اور ہنگامے شروع ہوگئے، صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ بابری مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی جائے، مسلمانوں کو اس سلسلہ میں بڑی ہوشمندی سے قدم اٹھانا ہے، انشاء اللہ حق غالب ہوکر رہے گا ؎

منزل مجھے ملے نہ ملے اسکا غم نہیں　　منزل کی جستجو میں مرا کارواں تو ہے۔

(مرتب)

راجیہ سبھا میں ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء کو حضرت مولانا اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند کی تقریر

اس وقت ایک اہم مسئلہ بابری مسجد کا ہے۔ اس مسجد کے بارے میں حالیہ عدالتی فیصلہ پر کل بھی لکھنؤ میں بہت بڑا مظاہرہ ہوا ہزاروں لوگوں نے گرفتاریاں دیں اور بہت سے لوگ گرفتار بھی کئے گئے جن میں ممبران اسمبلی اور دوسرے لوگ شامل ہیں ــــ بابری مسجد ۹۳۵ھ ۱۵۲۸ء میں بنی تھی۔ جب

اودھ کے گورنر شیخ بایزید نے بغاوت کی تو اس کو فرو کرنے کیلئے بادشاہ بابر اس علاقہ میں گئے تھے انھوں نے بغاوت کا خاتمہ کر کے میر محمد باقی کو اپنا گورنر بنایا۔ میر محمد باقی نے بابر کے آنے کی خوشی میں یہ مسجد تعمیر کی تھی اور تزک بابری میں لکھا ہے کہ خالی زمین پر وہ مسجد تعمیر کی گئی تھی ـــ اجودھیا گھاگھرہ دریا کے کنارے آباد ہے جس کی وجہ سے وہ سات یا آٹھ بار کٹ رہا ہے اور پہاں وہاں بستا رہا ہے۔ جو موجودہ شہر ہے وہ آٹھویں یا نویں مرتبہ آباد ہوا ہے۔ اجودھیا کے اندر آج بھی نو جگہیں ہیں جہاں رام جنم استھان کے طور پر مندر بنے ہوئے ہیں۔ اس میں کام چل رہا ہے۔ وہاں ۳۲۵ سال تک بابری مسجد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا مسجد جانی جاتی تھی اور اس میں نماز ہوتی تھی ـــ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے زمانہ میں کسی جیوتشی کو بلاکر اور زائچہ کھینچوا کر بابری مسجد کے احاطہ میں ایک جگہ کو منتخب کرایا اور انگریزوں نے کہا کہ یہ "رام جنم استھان" ہے اور ایک جگہ سیتا جی کی رسوئی بنادی یہ انگریزوں کا کارنامہ ہے۔ ان کی پالیسی تھی "ڈوائڈ اینڈ رول"۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت مسجد کے باہر سے اختلاف شروع ہوا۔

۱۸۸۵ء میں مہنت رگھوناتھ داس نے اس چبوترہ کے بارے میں کیس دائر کیا تھا، اس کیس میں مسجد کی چوہدی کا نقشہ بھی داخل کیا گیا تھا۔ اس نقشہ میں بابری مسجد کو مسلمانوں کی مسجد تسلیم کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اس کے باہر کا چبوترہ رام جنم استھان ہے جس پر مندر بنانے کی اجازت دی جائے لیکن عدالت نے اس کیس

کو خارج کر دیا۔ جج پنڈت تھا انھوں نے اس کے دلائل کو نہیں مانا اور کہدیا کہ ان دلائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں مندر بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پھر اس کے بعد مہنت رگھوناتھ داس نے اپیل کی وہ بھی خارج ہوگئی۔ تب یہ اختلافی مسئلہ وہاں شروع ہوا اور مختلف واقعات پیش آئے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا لیکن ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک بابری مسجد میں نماز باجماعت ہوتی رہی ہے اور امام و مؤذن بھی متعین تھے۔ اچانک ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات کو کچھ لوگ بابری مسجد میں داخل ہوئے اور بت رکھدیا۔ اجودھیا کے سب انسپکٹر پولیس رنجیت سنگھ نے اس وقت پولیس میں ڈائری درج کرائی کہ رات میں کچھ لوگ دیوار پھاند کر آئے اور انھوں نے مسجد میں مورتیاں رکھدیں انکو ہٹایا جائے ورنہ فضا خراب ہوگی اور اس کے بعد جب فضا خراب ہوئی تو سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور اس کے ساتھ ڈی۔ ایم کے نائر کی سازش سے یہ ہوا کہ دفعہ ۱۴۵ کے اندر اس کو قرق کرالیا گیا۔ تالے لگا دیئے گئے اور مسجد بند ہوگئی۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء میں کورٹ نے مسجد کا ایک چھوٹا سا دروازہ کھولنے کی اجازت دی کہ جو مورتیاں رکھدی گئی ہیں انکو بھوگ دیں۔ کورٹ کی اجازت کے بعد ٥ صحن میں نل لگوایا گیا ٥ مسجد کے چاروں طرف جو احاطہ ہے اس میں سنگ مرمر اور کالے پتھروں کا فرش بچھا کر پری کرما کا میدان بنالیا گیا ٥ دکھن کیطرف دو مندر بن گئے ٥ مسجد کے درمیانی گنبد پر جھنڈا لگایا گیا ٥ گیٹ کے اوپر رام جنم استھان لکھدیا گیا۔ یہ سب کچھ دفعہ ۱۴۵ میں مسجد

قرق ہوتے ہوئے پولیس کی موجودگی میں ہوا۔ دفعہ ۱۴۵ میں بابری مسجد کو قرق کرنے کے بعد اس کا پہلا رسیور پریے دت رام کو بنایا گیا۔ وہ ۱۸ سال تک رسیور رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک آنریری مجسٹریٹ کے کے ورما کو رسیور بنایا گیا۔ ورما کے خلاف ہاشم انصاری اور دوسرے لوگوں نے عدالت میں درخواست دی کہ انکے زمانہ میں مسجد میں یہ سب تبدیلیاں ہوئی ہیں اس لئے ان کو ہٹا کر دوسرے کو رسیور مقرر کیا جائے عدالت نے اس شکایت کو جائز تسلیم کرتے ہوئے رسیور بدل دیا۔ اس پر رویژن کا کیس ہوا۔ اور رویژن کی کاروائی کیلئے تمام کاغذات لکھنؤ چلے گئے اور آج تک وہ اسی طرح لٹکا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بار بار درخواستیں پیش ہوتیں لیکن معاملہ اسی طرح ہے۔ میں نے چیف منسٹروں سے کہا کہ یہ جھگڑے کی چیز ہے۔ عدالت سے اسے طے کراؤ ورنہ یہ کمیونل ٹینشن کا سبب بن سکتا ہے۔ دو تین مرتبہ میں نے مختلف چیف منسٹروں کو میمورنڈم دیا اور کہا کہ اس معاملہ کو جلد طے کیا جائے لیکن آج تک نہ ہو سکا۔ وہ کاغذات وہیں پڑے ہوئے ہیں۔ کیس کی تاریخ نہیں پڑتی۔ پانچ سال ہوئے اس رویژن کے کیس کو شروع ہوئے۔ خود ہائی کورٹ نے تشویش کا اظہار کیا کہ ایک کیس پانچ سال تک رہے جس میں ٹینشن بھی ہو سکتا ہے اس میں ڈھیلے نہیں ہونا چاہئے۔ فوراً نپٹارہ ہونا چاہئے لیکن وہ آج تک نہیں نپٹا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ نے یوپی گورنمنٹ اور مسلمانوں کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ اس کے بعد پریم ہنس راج نے مقدمہ دائر کیا

پھر نرموہی اکھاڑے کیطرف سے تیسرا مقدمہ دائر ہوا - بابری مسجد پر قبضہ کرنے کیلئے وقف بورڈ سنہ ۱۹۶۱ء گوپال سنگھ وغیرہ تمام پارٹیوں کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا مسجد کو بحال کرنے کیلئے اور ہائی کورٹ میں وقف بورڈ کے دعوی کو لیڈنگ کیس مان لیا گیا لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس معاملہ میں آج تک کچھ نہیں ہوا -

تقریباً دو سال سے وشو ہندو پریشد، رام جنم بھومی مکتی سمیتی اور مختلف تنظیمیں اس معاملہ کو لیکر ملک بھر میں نفرت پھیلا رہی ہیں - ۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء کو انھوں نے سیتا مڑھی سے جلوس نکالا - ۷ار اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء کو اجودھیا میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوا اور سرجو ندی کا پانی لیکر حلف اٹھایا گیا - ۹ر دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء کو یوپی کے ہمارے چیف منسٹر صاحب اجودھیا گئے رامائن میلے میں ریٹائرڈ جج کا تجربہ ریٹائرڈ آئی - جی دکشت ایک اور ریٹائرڈ جج ان سے ملے ان لوگوں نے چیف منسٹر صاحب سے کہا کہ ۹ر مارچ تک بابری مسجد کا تالا نہ کھولا گیا تو ہم لوگ جاکر تالا توڑ دیں گے اس کے بعد ۲۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو رمیش چندر پانڈے نے جو بابری مسجد کے کسی مقدمہ میں کسی طرف پارٹی نہیں تھے درخواست دی کہ بابری مسجد میں ہماری پوجا کیلئے رکاوٹ دور کی جائے - صدر منصف نے انکی درخواست یہ کہکر رد کر دیا کہ ابھی ہم اس میں فیصلہ نہیں کر سکتے، فائل نہیں ہے - پھر اس کی اپیل ڈسٹرکٹ سیشن جج فیض آباد کے یہاں کی گئی - اور انھوں نے ۳۰ر جنوری ۱۹۸۶ء کو وہ اپیل قبول کی اور یہ نہ

دیکھا کہ وہ پارٹی نہیں ہے اس کو پارٹی بنایا نہیں گیا ہے۔ جب یہ خبر پھیلی تو کچھ مسلمانوں اور کچھ مدعی جو اس کیس میں تھے وہ عدالت پہونچے اور انھوں نے کہا کہ ہماری بات سنی جائے لیکن انکی بات پر غور نہیں کیا گیا درخواست بھی نہیں لی گئی اور یکطرفہ فیصلہ دیدیا گیا اور ایک دن کے اندر تالا کھول کر اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ پوری کارروائی ملک بھر میں ریڈیو اور ٹیلیویژن پر سنائی اور دکھلائی گئی جو چیز ہو رہی ہے اس کی وجہ سے کئی جگہ فسادات ہو چکے ہیں۔

بابری مسجد، حقائق اور افسانے

یکم فروری ۱۹۸۶ء ۲۱ رجمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ سنیچر کے دن "بابری مسجد" واقع اجودھیا ضلع فیض آباد، ناجائز اور غیر منصفانہ طور پر نہایت ڈرامائی انداز سے "رام جنم استھان مندر" میں تبدیل کر دی گئی، اس حادثہ فاجعہ پر مسلمانوں کو جس قدر غم ہو کم ہے — یہ ظالمانہ اقدام محض جبر و تشدد اور کثرت طاقت کے نشہ میں کیا گیا ہے، لیکن دنیا کو فریب دینے کیلئے اس پر عدالت کے فیصلے کی چادر ڈال دی گئی ہے حالانکہ اس غیر قانونی عمل کو عدالت کا فیصلہ کہنا خود عدلیہ کی توہین ہے اور اب اس نام نہاد فیصلہ کو حق بجانب ثابت کی غرض سے "بابر" اور اس کی جانب منسوب "بابری مسجد" کی تاریخ مسخ کرنے کی ملک گیر تحریک چلائی جا رہی ہے۔ اس رسوائے زمانہ تحریک کا سلسلہ اگرچہ عرصۂ دراز سے جاری تھا مگر اسے آج کل تیز تر کر دیا گیا ہے، اردو سو ہندو پریشد

آریہ پرتی ندھی سبھا، بھارتیہ جنتا پارٹی وغیرہ فرقہ پرست تنظیمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ "بابری مسجد" کو بادشاہ بابر نے رام جنم استھان مندر توڑ کر اس کے کھنڈر پر تعمیر کرایا تھا، اس لئے اس مسجد کو ہندو فرقہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس بے بنیاد اور من گھڑت افسانے کو ایک صحیح واقعہ باور کرانے کیلئے علم و تحقیق کی آبرو کو بالائے طاق رکھ کر پوری جسارت کے ساتھ تزک بابری، آئین اکبری، اور عالمگیری نامہ جیسی اہم تاریخی کتابوں کا بالکل غلط طور پر حوالہ بھی دیا جارہا ہے۔

اس لئے جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۱ ر ۲۲ رفروری ۱۹۸۶ء نے ضرورت محسوس کی کہ بابری مسجد کی صحیح تاریخ عوام کے سامنے پیش کیجائے تاکہ سرکاری و غیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا یہ بادل چھٹے جس نے ملک کی فضا کو خطرناک حد تک مسموم بنا دیا ہے اور ملک کا انصاف پسند طبقہ کذب و افترا کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس انتہائی نازک معاملہ میں علم و تحقیق کی روشنی میں غور کر سکے چنانچہ حضرت مولانا اسعد مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علمائے ہند نے یہ خدمت احقر کے سپرد کی، مظلوم بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ تحریر اسی حکم کی تعمیل میں سپرد قلم کی گئی ہے۔

کیا بابر اجودھیا آیا تھا؟ چونکہ یہ مظلوم مسجد بابر کی جانب منسوب ہے،

اس لئے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے بابر نے تعمیر کرایا تھا، پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا کہ بابر نے اجودھیا آکر رام جنم استھان مندر کو گرادیا اور پھر اس کی جگہ پر یہ مسجد بنوائی چنانچہ حکومت یوپی کے محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ "اتر پردیش" میں بعینہ یہی بات کہی گئی ہے "۱۹۲۸ء میں بابر یہاں (اجودھیا) آیا تھا اس نے ایک ہفتہ قیام کیا اور جنم استھان مندر کو گراکر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس مندر کے ملبہ پر تعمیر کی تھی" (ماہنامہ اتر پردیش اپریل ۱۹۸۲ء ص ۲۷)

اس سے پہلے یہ طے ہوجانا ضروری ہے کہ "بابر" اجودھیا آیا تھا کیونکہ جنم استھان مندر گرانے کی داستان اسی دعویٰ کی بنیاد پر گھڑی گئی ہے ــــ مؤرخین ہند خواہ مسلم دور حکومت سے تعلق رکھتے ہیں یا اس عہد کے بعد کے ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ "بابر" کے حالات میں مستند ترین ماخذ خود اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ سوانحی روزنامچہ ہے جو علمی حلقوں میں "تزک بابری" کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

"بابر" نے ۸۹۹ھ سے جبکہ اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی، اسے لکھنا شروع کردیا تھا اور اپنے مرض وفات میں مبتلا ہونے سے چھ ماہ قبل یعنی ۹۳۶ھ تک اس سلسلہ کو جاری رکھا، تزک میں اسکی آخری تحریر ۳ محرم ۹۳۶ھ کی ہے اور اسی سال رجب میں بیمار ہوا اور اسی بیماری میں ۵ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ کو انتقال کرگیا،

اس طرح یہ روزنامچہ آخری ایک سال کے علاوہ اس کے پورے سوانح حیات کو حاوی ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تفصیل سے قلمبند کردیا ہے حتیٰ کہ وہ جن مقامات پر گیا ہے وہاں کے عوام کی حالت، جانوروں کی قسمیں، آب و ہوا، باغات اور عمارتوں کا تذکرہ بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے، اصل کتاب ترکی زبان میں ہے، اس کا سب سے پہلا ترجمہ "اکبر" کے حکم سے خانخاناں عبدالرحیم نے فارسی میں کیا تھا، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، اس کے بعد انگریز مورخ "اے ایس بیورج" نے دی بابرنامہ ان انگلش کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو دو جلدوں میں ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں عام طور پر یہی ترجمہ رائج ہے، مسز بیورج نے ترجمہ کے ساتھ تفصیلی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ "بابرنامہ" کے نام سے اردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے، اب یہی انگریزی اور اردو کے دونوں ترجمے تذکرہ نویسوں کے لیے ماخذ و مرجع کا کام دیتے ہیں، کوئی بھی شخص ان ترجموں کو اول سے آخر تک پڑھ جائے اسے ان میں کہیں بھی "بابر" کے "اجودھیا" آنے کا ذکر نہیں ملے گا، البتہ ۹۳۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس کی یہ تحریر ضرور ملتی ہے "ہفتہ ۷ رجب کو ہم نے "اودھ" سے دو تین کوس (چوتھی) برگھا گھر" اور سردا (ساردا) کے سنگم پر قیام کیا (یہ سنگم بہرائچ میں ہے)، اس وقت تک "شیخ بایزید" سردا (ساردا) کی دوسری جانب تھا۔

اور سلطان (حسین تیمور) سے خط و کتابت کر رہا تھا اس کی دھوکہ بازیوں
سے واقفیت کی بناء پر ہم نے بوقت ظہر سلطان کو حکم دیا کہ وہ دریا پار
کرنے کیلئے تیار ہو جائے، قباچہ کے پہنچنے پر انھوں نے فوراً دریا پار
کیا وہاں پچاس گھوڑے اور تین چار ہاتھی موجود تھے وہ مقابلے کی تاب
نہ لاسکے اور فرار کی راہ اختیار کی چند لوگ گھوڑے سے اتر گئے ان کے
ان کے سر کاٹ کر حاضر کئے گئے" (بابر نامہ اردو ۳۳۹) بابر کے اس بیان
سے معلوم ہوا کہ وہ "شیخ بایزید" کی بغاوت فرو کرنے کے لئے رجب ۹۳۵ھ
میں اس دیار میں آیا تھا مگر بقول خود اس کا قیام اجودھیا سے چھ میل
دور ساردا کے سنگم پر ہوا، شیخ بایزید کی شکست کے بعد اپنے
ایک امیر "سید میر باقی اصفہانی" کو اس علاقے کا حاکم مقرر کر کے یہیں
سے براہ الہ آباد و کڑہ بہار چلا گیا جہاں سلطان محمود بن سکندر لودھی
نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا، تقریباً ایک ماہ بہار کے علاقہ میں گذر
کر واپس لوٹا اور واپسی کے موقع پر بھی وہ اجودھیا سے کافی فاصلے
سے گذرا جیسا کہ تزک کی درج ذیل تحریر سے ظاہر ہے "بروز دوشنبہ
۲۲ رمضان کو ہم چوپادہ میں پہونچے چترکھ کے راستے دریائے سرجو
کے کنارے ہوتے ہوئے بہار اور سردا (ساردا) کے قصبوں سے
فارغ ہو کر اور دس کوس (۲۰ میل) چلنے کے بعد دریائے سرجو کے
کنارے کیلرہ نامی گاؤں میں جو فتحپور کے علاقے میں ہے قیام کیا
ہم نے کئی دن اس مقام پر گذارے، یہاں آب رواں ہے، اچھی

عمارتیں ہیں، اشجار خاص طور پر آم کے درخت اور رنگ برنگ کی چڑیاں ہیں۔ پھر ہم نے غازی پور کیطرف کوچ کا حکم دیا (بابرنامہ اردو) ان دونوں تحریروں کے علاوہ "تزک بابری" میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جس سے "بابر" کے اس دیار میں آنے کا سراغ لگایا جاسکے — تزک بابری کے علاوہ طبقات اکبری تالیف خواجہ نظام الدین احمد، اکبرنامہ ابوالفضل، منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، خلاصۃ التاریخ منشی سبحان رائے، تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، منتخب اللباب محمد ہاشم خانی خان، غرضیکہ کسی بھی معاصر یا غیر معاصر مستند و معتبر تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں ملتا، اس لئے جس بنیاد پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، جب اس بنیاد کا وجود ہی نہیں تو عمارت کا جو حال ہوگا اہل نظر سے مخفی نہیں۔ بابر کے حالات میں اس وقت جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں "بابر" کے نہ صرف اجودھیا بلکہ کسی بھی مقام پہ مندر توڑنے کا ذکر نہیں ہے حتیٰ کہ جدو ناتھ سرکار، ایسٹ اور ڈاؤسن نے بھی بابر کی مندر شکنی کا کوئی واقعہ نقل نہیں کیا ہے، جبکہ یہ مورخین مسلم حکمراں کی مندر شکنی کے واقعات میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں ان تاریخی شواہد کے علاوہ خود بابر جس ذہن و مزاج کا حکمراں ہے اس کے پیش نظر یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی بھی مذہبی عبادت گاہ پر غلط نگاہ ڈالے گا اس کے مزاج کو سمجھنے کیلئے وہ وصیت نامہ کافی ہے جو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کیلئے قلمبند کیا تھا وہ اس میں لکھتا ہے — اے فرزند!

ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس کی بادشاہت عطا کی۔ تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام تعصبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاصکر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے زیر بار رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اسکے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے۔ شیعوں اور سنیوں کے اختلاف سے چشم پوشی کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ جس طرح کہ انسانی جسم بنتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے۔ یکم جمادی الاولی ۹۳۵ھ دانڈیا ڈی ڈانڈ ص ۳۹- از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند) ان دلائل و شواہد کی روشنی میں ایک دیانتدار مورخ اور حقیقت پسند مبصر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ "بابر" مندر شکنی کے الزام سے قطعی بری ہے چنانچہ پروفیسر "شری رام شرما" اپنی مشہور کتاب "مغل امپائر ان انڈیا" میں پوری صفائی سے لکھتے ہیں: "ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی کہ "بابر" نے کسی مندر کو منہدم کیا یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض

اس لیے کی کہ وہ ہندو ہے (ص۵۵ ایڈیشن ۱۹۲۵ء بحوالہ معارف فروری ۱۹۵۶ء)

تلاش حقیقت | جب یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ "بابر" اجودھیا آیا ہی نہیں تو اس کے بابری مسجد تعمیر کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا اب ہمیں تاریخ کی روشنی میں پتہ لگانا چاہئے کہ اس مسجد کا بانی حقیقتاً کون اور اس نے کب اسے تعمیر کرایا ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ بابری مسجد اجودھیا ہندوستان میں موجود لاکھوں مسجدوں کے مقابلے میں کسی خصوصی امتیاز کی حامل نہیں ہے، اسی لئے مورخین جس طرح عام مسجدوں کی تاریخ بیان کرنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتے بعینہ "بابری مسجد اجودھیا" کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے، بالفرض اگر یہ مسجد کسی خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی یا اس کی تعمیر کے ساتھ کوئی جذباتی واقعہ وابستہ ہوتا یا کم از کم کسی بادشاہ کے تعمیر کا شرف حاصل ہوتا تو مورخین اس طرح سے اس کے بارے میں خاموش نہ رہتے بلکہ اس کی تفصیلات ضرور لکھتے لیکن مورخین کے اس سکوت کے باوجود "بابری مسجد" کی تاریخ تاریکی میں نہیں ہے بلکہ اس میں نصب کتبوں کی بناء پر آئینہ کی طرح روشن ہے۔

آج کی دنیا میں کتبات کی جو اہمیت ہے، وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، آج حکومتیں ان کی فراہمی اور حفاظت پر کروڑوں روپئے خرچ کر رہی ہیں اور ان سے صرف عمارتوں ہی کی تاریخ معلوم نہیں کی جاتی بلکہ قوموں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں انھیں

مستند ترین مواد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بابری مسجد کے کتبے اسے اتفاق ہی کہیے کہ "بابری مسجد" میں ایک کے بجائے تین کتبے نصب کیے گئے تھے جن میں دو تاریخی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ انہیں مسجد کی تعمیر کا سن اور بانی کے نام کی تصریح موجود ہے۔ (۱) یہ کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، جس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	
بنام آنکہ او دانا ست اکبر	کہ خالق جملہ عالم لامکانے	درود مصطفےٰ بعد از ستائش
کہ سرور انبیا ز بدہ جہانے	فسانہ در جہاں بابر قلندر	کہ شد در دور گیتی کامرانے
چنانکہ سطلع کشور گرفتہ	زمیں را چوں مہار زر آسمانے	دراں حضرت یکے سید معظم
کہ نامش میر باقی اصفہانؒ	مشیر سلطنت تدبیر ملکش	کہ زیں مسجد حصار مستانے
خدا باد بجہاں تابندہ ماند	کہ خیر و بخت و تخت و زندگانے	دریں عہد و دریں تاریخ میموں
کز نصد پنج وسی بودہ نشانے	ان دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جا سکا	

ان اشعار میں پہلے اللہ کی حمد پھر نبی کریمؐ پر درود ہے اور آپؐ کو تمام انبیاء کا سردار و خلاصۂ کائنات کہا گیا ہے پھر دو شعروں میں "بابر" کی تعریف

اور اس کی فتح و کامرانی کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ بابر کو بادشاہ کے بجائے قلندر کہا گیا ہے، یہ لفظ صوفیوں کی اصطلاح میں مرنجاں مرنج اور ہر قسم کے مذہبی تعصب سے بے نیاز شخصیتوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ پھر بیان کیا گیا ہے کہ "بابر کے درباریوں میں ایک صاحب عظمت سید ہیں جن کا اسم گرامی "میر باقی اصفہانی" ہے پھر میر باقی اصفہانی کے انتظام ملکی کی تعریف ہے اس کے بعد کے شعر میں بتایا گیا ہے کہ ان ہی میر باقی کی بدولت یہ مسجد روشن ضمیروں کیلئے حصار بنائی گئی ہے اس کے بعد کے چار شعروں میں ان کے لئے دعا ہے کہ خدایا دنیا میں ان کے اس خیر یعنی مسجد اور ان کے مقام و مرتبہ اور زندگی کو تابندہ رکھ" کہ ۹۳۵ھ کی یہ یادگار باقی اور پائدار رہے — مسز بیورج نے اپنے ترجمہ "دی بابر نامہ ان انگلش" کی دوسری جلد کے ضمیمہ میں "بابری مسجد اجودھیا" کے کتبات کے عنوان کے تحت منبر کے بائیں سمت والے کتبہ کے علاوہ مندرجہ بالا کتبہ کو بھی درج کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کے آٹھ شعروں میں سے شروع کے صرف تین اشعار نقل کئے ہیں، شاید بقیہ اشعار نہ پڑھے جا سکے اس لئے انھیں چھوڑ دیا۔

(۲-۳) یہ دونوں کتبے مسجد کے اندرونی حصہ میں منبر کے داہنی اور بائیں جانب تھے۔

داہنی سمت کا کتبہ

بمنشائے بابر خدیو جہاں		بسانیکہ با کاخ گردوں عناں
بنا کرد ایں خانۂ پائیدار		امیر سعادت نشاں میر خاں
بماند ہمیشہ چنیں بانیش		چناں شہریار زمین و زماں

بائیں جانب کا کتبہ

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش — بنایست تا کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد این مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی دسال بنایش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی
۹۳۵ھ

معمولی فرق کے علاوہ ان دونوں کتبوں کے مفہوم میں یکسانیت ہے البتہ دوسرے کتبہ کا آخری شعر دعائیہ ہے اور تیسرے کے آخری جملہ سے تاریخ تعمیر نکلتی ہے، اس آخری کتبہ کو مسز بیورج نے بھی نقل کیا ہے۔

۲۷ مارچ ۱۹۳۴ء ۱۱ ذوالحجہ ۱۳۵۲ھ کو اجودھیا میں ایک زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، اس موقع پر فسادیوں نے "بابری مسجد" میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا تھا اسی وقت ان دونوں کتبوں کو بھی اکھاڑ لے گئے، لیکن بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبہ کی ایک نقل تیار کرا کے تہور خاں ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا البتہ دائیں جانب کی نقل وہ بھی نہ کرا سکے۔ سید بدرالحسن فیض آبادی کے پاس اس ضائع شدہ کتبے کی ایک نقل موجود تھی اسی نقل کے حوالہ سے یہ کتبہ یہاں درج کیا گیا ہے۔ ان تینوں کتبوں کی نقل اور اس کا فوٹو (ضمیمہ فارسی وعربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵ء ناگپور میں موجود ہے جسے حاصل کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد کی مرکزی در والا اصلی کتبہ اور منبر کی بائیں جانب والا نقل شدہ کتبہ یہ دونوں کتبے ۱۹۴۹ء سے پہلے تک مسجد میں موجود تھے، اب موجود

ہیں یا وہ بھی بیراگیوں کے دست کرم کے شکار ہو گئے، کیوں کہ تقریباً ۴۰ سال کی طویل مدت سے مسلمانوں کا اپنی اس قدیم عبادت گاہ کے پاس سے گذرنا بھی ممنوع ہے اس کے اندر جانا تو بہت دور کی بات ہے اس لئے اس وقت ان کتبوں کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ان کتبوں کے اب مسجد میں ہونے یا نہ ہونے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ ان کی مستند نقلیں حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ کتبے آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ "بابری مسجد" کا بانی شاہ بابر نہیں بلکہ اس کا ایک امیر "سید میر باقی اصفہانی" تھا جسے بابر نے ۹۳۵ھ/۱۵۲۹ء میں علاقہ اودھ کا حاکم مقرر کیا تھا میر باقی نے اسی تقرری کی یادگار کے طور پر یہ مسجد تعمیر کرائی تھی جیسا کہ پہلے کتبہ کے آخری مصرعہ "کہ نہ صد بنج وستی ۔۔۔ نشانی" سے واضح ہے ۔ اور تیسرے کتبہ کے دوسرے شعر "بنا کرد ایں مہبط قدسیاں" سے اشارہ ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر عدل وانصاف کے مطابق ہوئی ہے کیوں کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرشتوں کی وہ ورود گاہ وہ مقام کبھی نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد ظلم و جور پر رکھی گئی ہو، اور اسلامی قوانین کی رو سے کسی مذہب کی عبادت گاہ کو منہدم کرنا ظلم ہے، اور اس غیر منصفانہ حرکت سے آنحضرتؐ نے سختی سے منع فرمایا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج نے ان کے ترجمہ اور تشریح میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد جنم استھان کو توڑ کر بنائی گئی ہے ۔ اسی طرح ویلیم ارسکن، آر بروک ولیم جنھوں نے بابر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے یا بابر کے کسی مندر توڑنے کا ذکر

نہیں کرتے ۔ ان مستند تاریخی شواہد کے علاوہ مسجد کا جائے وقوع بھی یہی کہتا ہے کہ یہاں مسجد سے پہلے مندر نہیں ہو سکتا کیوں کہ مسجد کے احاطے کی چہار دیواری سے متصل پورب اور دکھن سمت "گنج شہیداں" ہے یعنی ان شہیدوں کے مزارات جو سید سالار مسعود غازی کے رفقاء میں سے تھے اور دوخدم کے فاصلہ پر "قاضی قدوہ" کی قبر ہے جو غالباً خاندان قدوائی کے مورث اعلیٰ تھے ۔

مسعود غازی پانچویں صدی ہجری میں اس دیار میں آئے تھے ..... اس لئے اس مقام پران کے رفقاء کے مزارات کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ اس حصۂ زمین پر اس وقت کوئی مندر وغیرہ نہیں تھا کیونکہ کسی مندر کے متصل شہیدوں کے مزارات نہیں بنائے جاتے، ان مزارات کے بعد محلہ قضیانہ اور ایک اور مسلم محلہ کی آبادی شروع ہو جاتی تھیں جس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی' کا آبائی مکان تھا اور مسجد کے پورب سمت ذرا فاصلے پر محلہ بیگم پورہ تھا جو نوابان اودھ کے دور تک خالص مسلم آبادی پر مشتمل تھا، اور مسجد کے اتر جانب احاطہ مسجد سے بالکل متصل تقریباً پندرہ میٹر چوڑی قدیم سڑک ہے اس سڑک کے متصل اتر پورب سمت میں جنم استھان کا احاطہ ہے۔ الحاصل اس قدیم سڑک سے دکھن جانب خالص مسلمانوں کی آبادی اور ان کے قدیم مزارات ہیں، اس جانب نوابان اودھ کے دور سے پہلے نہ ہندو آبادی تھی اور نہ کوئی مندر وغیرہ، ان کے سارے مندر سڑک کے اتری سمت میں تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی جگہ پہلے ہی سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھی اس لئے یہاں کسی مندر کے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

چنانچہ آج سے تقریباً آٹھ نو سال قبل حکومت نے محکمۂ آثار قدیمہ کے ذریعہ "بابری مسجد" کی مغربی دیوار سے بالکل متصل بڑے پیمانہ پر کھدائی کرائی تھی، اس کھدائی سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ یہاں مسجد سے پہلے کسی قسم کی کوئی عمارت نہیں تھی کیونکہ کھدائی کے بعد کسی عمارت کے کوئی آثار اس جگہ نہیں پائے گئے۔ اس کھدائی کی رپورٹ حکومت کے پاس محفوظ ہے۔ ان دلائل و قرائن کے بعد اس سلسلے میں ہم ایک ہندو محقق کی تحقیق پیش کر رہے ہیں تاکہ حقیقت حال اچھی طرح روشن ہو جائے۔

جنم استھان کے بارے میں ایک ہندو محقق کی تحقیق

ڈاکٹر آر، ایل شکلا استاذ دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۸۲ء میں ایک مقالہ بعنوان (رام کی نگری اجودھیا جھوٹ یا سچ) لکھا تھا، یہ اقتباس اسی مقالہ سے ماخوذ ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بعض مورخین "مہابھارت" میں "بیان کئے گئے" "رام" کو حقیقی کردار ملتے ہیں یہ مورخین رام کا زمانہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مانتے ہیں، اور مہابھارت کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار پہلے کا بتایا جاتا ہے، اگر ہم اس تحقیق کو صحیح مان لیں تو رامائن میں جن مقامات کا تعلق رام جی سے بیان کیا گیا ہے ان جگہوں میں حضرت عیسیٰ سے ڈھائی ہزار سال پہلے انسانی زندگی کے آثار ملنے چاہئیں اسی مقصد کے پیش نظر تین مقامات کی کھدائی ہوئی (۱) فیض آباد ضلع میں "اجودھیا" کی (۲) الٰہ آباد سے ۳۵ کلو میٹر شمال کی سمت موضع "شرنگویر پور" کی (۳) الٰہ آباد میں واقع "بھاردواج" آشرم کی، اجودھیا میں کھدائی آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے بھی ہوئی تھی، اسوقت بھی وہاں آبادی کے نشان حضرت عیسیٰ سے ۷۰۰ سال پہلے کے ہی ملے تھے اور اب سے تقریباً دس سال پہلے دوبارہ بڑے پیمانے پر وہاں (اجودھیا) میں کھدائی ہوئی، اس کھدائی سے بھی آبادی کے متعلق زمین

نتیجہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ سے زیادہ سے زیادہ ۷۰۰ سال قبل کی آبادی کے نشان پائے گئے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی (موجودہ) اجودھیا "رام جی" کی نگری تھی جو ان کی جنم بھومی مانی جاتی ہے تو (سوال پیدا ہوتا ہے) کہ رام جی کے زمانہ سے اجودھیا کے زمانہ کا جوڑ کیوں نہیں قائم ہوتا؟ اجودھیا کی آبادی حضرت عیسیٰ کے زمانہ سے ۶۰۰ یا ۷۰۰ سال پہلے کی ہے جبکہ رام جی کا زمانہ عیسیٰ سے ۲۵۰۰ سال قبل یا بعض مؤرخین کی تحقیق کے اعتبار سے اس سے بھی پہلے کا ہے تو پھر اجودھیا رام کی جنم بھومی کیسے ہو سکتی ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مگدھ کے علاقوں میں پہلے جنگل ہی جنگل تھے، ان علاقوں میں تقریباً ۵۰ سے ۶۰ انچ تک بارش ہوتی ہے جس کی بنا پر یہ میدانوں میں جنگل کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے، جب تک ان جنگلوں کو کاٹ کر صاف نہیں کیا گیا وہاں بستیوں کا آباد ہونا ممکن نہ تھا۔ ان جنگلوں کی صفائی کا کام انھیں جلا کر یا لوہے کے کلہاڑوں سے کاٹ کر کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ ملے ہو چکا ہے کہ لوہے کا استعمال ان علاقوں میں ۷۰۰ سال قبل از مسیح نہیں تھا — قدیم پالی ادب میں بڑی بڑی حکومتوں کا ذکر ہے جنھیں "مہا جن پد" کہا جاتا تھا، نیز پالی ادب میں "اجودھیا" کا بھی ذکر ہے اسکے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "بدھ" کے عہد میں اس علاقہ میں حکومت کا قیام ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کسی حکومت کے قیام کا ثبوت نہ تو قدیم ادب سے ملتا ہے اور نہ آثار قدیمہ ہی سے، اس لئے جو لوگ اجودھیا کو رام کی جنم بھومی کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔

بالمیکی رامائن (کے مطابق) "کوشل" کا پایۂ تخت "اجودھیا" "سرجو ندی" کے داہنی سمت سرجو سے ڈیڑھ یوجن (۱۲ میل) کے فاصلے پر تھا اور سرجو اس سے

پچھم سمت تھی، اور آج کا اجودھیا سرجو کے بالکل کنارے پر ہے پھر آج سرجو اجودھیا سے پورب سمت ہے نہ کہ پچھم میں (بالمیکی کے اس بیان سے بھی موجودہ اجودھیا رام کی جنم بھومی نہیں ہو سکتا ہے (ایٹک سنواد، نومبر ۱۹۸۶ء ص ۱۲، ۱۳) پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ہندو مذہب کی اہم ترین کتاب "اتھروید" سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ "ایودھیا" اسم علم (نام) کے طور پر نہیں بلکہ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

"انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ" کے فیلو پروفیسر بی، بی لال" جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ "کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ (نام) کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اس لئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے" (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی شمارہ ۱۰، ۲۰ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۲، ۱۵) ان تحقیقات کے علاوہ بعض محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ رام کرشن کا (جن کی راجدھانی اجودھیا بتائی جاتی ہے) وہ کوسل کے بادشاہ تھے ہی نہیں بلکہ وہ بنارس کے حکمراں تھے۔ چنانچہ اے۔ ایل باشم لکھتے ہیں "یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ "رام" کوسل کا بادشاہ تھا کیونکہ اس افسانے (رامائن) کا قدیم ترین نسخہ جو ہمارے پاس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنارس کا بادشاہ تھا جو تھوڑے زمانہ کیلئے ایک اہم حکومت تھی۔

(ہندوستان کا شاندار ماضی ص ۶۷، ۶۸ ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء)

الغرض قدیم ہندو ادب اور جدید تحقیقات دونوں کے اعتبار سے موجودہ "اجودھیا" کا تعلق رامائن کے کردار (ہیرو) "رام" سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اجودھیا کی آبادی رام کے اٹھارہ سو سال بعد وجود میں آئی ہے، اس لئے عدم

تحقیق کی رو سے اجودھیا کو رام جنم بھومی کہنا انتہائی مضحکہ خیز ہے جس کی حیثیت دیومالائی افسانے سے زیادہ نہیں۔ غالباً اسی بناء پر غیر ملکی سیاح جب ہندوستان کے قدیم آثار کی سیر کیلئے آتے ہیں تو انھیں بنارس سارناتھ، گدھ، نالندہ کھجوراہو اور اجنتا وغیرہ کی سرکاری وغیر سرکاری طور پر سیر کرائی جاتی ہے اور "اجودھیا" کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے جب خود اجودھیا کا رام جنم بھومی ہونا تاریخی و تحقیقی شواہد سے غلط ہے تو اس میں واقع ایک مسجد کو تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بعد متعین کر کے یہ کہنا کہ اسی جگہ رام جی پیدا ہوئے تھے ایک من گھڑت افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے ؟

اس افسانہ کی ابتداء اور اس کے مقاصد رام جی کے زمانہ سے تقریباً سوا چار ہزار سال کے بعد بابری مسجد اجودھیا کی تعمیر ہوئی اگر واقعتاً اس جگہ کوئی مندر ہوتا اور اس اہمیت کا جسے آج ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس کے اوپر ملک کی سالمیت اور یگانت کو قربان کرنیکا تصد کر لیا گیا ہے تو اس کا ذکر مذہبی و تاریخی کتابوں میں ضرور ہوتا یا کم از کم محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے موقع پر اس کے کچھ آثار و نشانات ہی ملتے لیکن سطور بالا میں معلوم ہو چکا کہ "اجودھیا" کی آبادی کا وجود "رام جی" کے زمانہ سے تقریباً اٹھارہ سو سال بعد ہوا ہے تو پھر "رام جی" کی وہاں پیدائش کیسے ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کی یادگار میں اس جگہ مندر بنایا جاتا ــــــ دراصل رام جنم استھان کا یہ قضیہ انگریزوں کی منحوس "ڈپلومیسی" "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پیداوار ہے، واجد علی شاہ کے ابتدائی دور میں انگریزوں نے اس افسانہ کے پلاٹ کو تیار کیا، وہ اس طرح کہ ایک بدھشٹ نجومی کو پہلے سے تیار کیا چنانچہ اس نے انگریزوں کی منشاء کے مطابق زائچہ کھینچ کر "جنم استھان" اور "سیتا رسوئی گھر" کو بابری مسجد کے احاطہ کے اندر ہونا متعین کیا، پھر ہندو طبقہ کے بعض مفاد پرست افراد کو آمادہ کیا گیا کہ وہ ان دونوں مقامات کے

حاصل کرنے کی کوشش کریں چونکہ نواب واجد علی شاہ کا وزیر نقی علی خاں رشوت خور ہونے کے ساتھ انگریزوں کا وفادار تھا اس لئے اس نے بھی اس افسانے کے خاکے میں رنگ بھرنے کی خدمت انجام دی اور "واجد علی شاہ" کو اس پر راضی کر لیا کہ حدود مسجد سے باہر لیکن اس کے احاطہ کے اندر رام استھان اور سیتا رسوئی گھر کیلئے جگہ دیدی جائے چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل داہنی سمت احاطہ کی دیوار سے متصل سیتا رسوئی کیلئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں اور پورب کی طرف "جنم استھان" کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ فٹ چوڑی جگہ دیدی گئی جس پر ایک بالشت بلند چبوترہ بنانے کی اجازت تھی۔ اس موقع پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا، جو اب تک بالکل کھلا ہوا تھا، یہ ہے سیتا رسوئی اور جنم استھان کی حقیقت

جنم استھان کو جس دیومالائی حیثیت سے ثابت کیا گیا تھا وہ عوام کو کسی حد تک متاثر کر سکتا تھا، لیکن پڑھا لکھا طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس دیومالائی کارروائی کے ایک عرصہ بعد جب فیض آباد کا نیا گزیٹیر مرتب کیا گیا تو پہلی بار اس میں یہ افسانہ بھی ایجاد کر کے لکھا گیا کہ ۱۵۲۸ء میں "بابر" اجودھیا آیا اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا، اس قدیم مندر رام جنم استھان کو ڈھا دیا اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جو ابتک "بابری مسجد" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ حکومت اترپردیش نے ۱۹۶۰ء میں ضلع فیض آباد کا جو گزیٹیر شائع کیا اس میں اسی انگریزی افسانہ کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے درج کر دیا، حکومت یوپی کا یہ رویہ بتا رہا ہے کہ ہماری حکومت ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کی غلام ہے جو آزاد قوم کیلئے انتہائی ننگ و عار کی بات ہے۔

اختلاف کا آغاز بہر حال انگریزوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور اجودھیا میں آباد ہندو مسلم دونوں فرقوں میں اس مسئلہ کو لیکر کشیدگی شروع ہوگئی چنانچہ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رگھوبیر داس مہنت نے سب جج کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ جنم بھومی استھان پر کوئی عمارت نہیں ہے اور پجاریوں کو جاڑا، گرمی، برسات میں تکلیف ہوتی ہے لہٰذا اس پر عمارت بنانے کی اجازت دی جائے اس نے اپنے دعویٰ میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کے اعتراض پر ڈسٹرکٹ جج نے رام جنم بھومی چبوترہ پر عمارت بنانے سے روک دیا ہے۔

سب جج ہری کشن پنڈت نے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا، وہ اپنے فیصلے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، اس احاطہ میں جس پھاٹک سے داخل ہوتا ہے اس پر لفظ اللہ کندہ ہے اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترہ ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے، اس چبوترہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم استھان ہے، چبوترہ کے چاروں طرف مسجد کی دیوار ہے چبوترہ اور مسجد کے درمیان علیٰحدہ علیٰحدہ حد بندی ہے، اگر اس چبوترہ پر مندر تعمیر ہوا اور اس میں گھنٹیاں اور سنکھ بجائے گئے اور مسلمانوں کا گذر ہوتا رہا تو مستقبل میں بہت زیادہ خون خرابہ کا اندیشہ ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہو سکتی ہیں اس لئے مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کا مطلب بلوا، قتل اور فساد کو دعوت دینا ہے اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے، اس مقدمہ کے دعویٰ اور فیصلہ دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنم استھان کا چبوترہ مسجد سے باہر تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اپیل بھی ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے ۲۶ مارچ ۱۸۸۵ء کو خارج کردی، دیکھئے رسول اپیل ۲۷ ۱۸۸۶ء اگرچہ اس مقدمہ کے وقت سے دونوں فرقوں کے درمیان عملی طور پر کشیدگی پیدا ہوگئی جو دن بدن بڑھتی رہی لیکن مسلمان

معمول کے مطابق مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہے چنانچہ تعمیر کے وقت یعنی ۹۳۵ھ ۱۵۲۹ء سے
۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک بغیر کسی رکاوٹ کے پنج وقتہ باجماعت نماز ہوتی رہی اور مستقل
طور پر اس مسجد کے مؤذن اور امام مغلیہ عہد سے برابر متعین ہوتے رہے، مسجد کے مصارف
کیلئے مغلیہ عہد میں ساٹھ روپئے سالانہ سرکاری خزانہ سے مقرر تھا، نوابان اودھ کے
دور میں یہ رقم بڑھا کر تین سو روپئے تین آنہ ۶ پائی کر دی گئی، برٹش حکومت نے بھی اس
رقم کو جاری رکھا پھر بندوبست اول کے وقت رقم کے بجائے دو گاؤں "بھورن پور"
اور "شولا پور" متصل اجودھیا بطور معافی ..... دیئے گئے جن کی آمدنی برابر مسجد کے
مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹر زیر دفعہ ۳۷ میں اس وقت کے متولی، جواد حسین
ساکن موضع شہنواں ڈاکخانہ درشن نگر ضلع فیض آباد، اور جائداد کی تفصیل، عمارت
"مسجد بابری مع آراضی واقع بھورن پور اور شولا پور تحصیل و ضلع فیض آباد درج ہے"
سپر سنی وقف ایکٹ ۱۳ر ۱۹۲۰ کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے
اس کا باقاعدہ رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔ غرضیکہ ۱۹۴۹ء تک تاریخی
اور قانونی ہر اعتبار سے "بابری مسجد" بغیر کسی اختلاف و نزاع کے مسجد کی حیثیت سے
مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور مسلمان بغیر کسی مزاحمت اور روک ٹوک کے اس میں پنج
وقتہ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔

مسجد میں مجرمانہ طور پر مورتی کی تنصیب ۱۹۴۷ء میں ملک کے اندر بالخصوص یوپی،
دہلی، میوات، ہریانہ، پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فساد
اور قتل و خوں ریزی کے حادثات ہوئے کہ اس نے ملک کے سارے نظام کو کچھ دنوں
کیلئے معطل کر کے رکھدیا، اسی اتھل پتھل اور افراتفری کے زمانہ میں ۲۲ر ۲۳ر دسمبر

۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنومان گڑھی کے مہنت" ابھے رام داس" نے ضلع مجسٹریٹ
کے کے نائر کی سازش اور اپنے چیلوں کی مدد سے مسجد کی دیوار پھاند کر گھس گئے اور
مسجد کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر رام کی مورتی رکھدی، صبح کو جب مسلمان نماز فجر
پڑھنے گئے تو مورتی دیکھکر حیرت میں پڑ گئے اور اسی وقت مورتی نکالنے کا مطالبہ کیا
چنانچہ ۲۳ کی صبح کو ڈیوٹی پر متعین پولیس" ماتو پرشاد" نے اس وقت کے تھانہ انچارج
"شری رام دیو" کو جو تحریری رپوٹ درج کرائی اس میں لکھا ہے کہ "ابھے رام داس، سکل داس
سدرشن داس اور پچاس ساٹھ آدمی نامعلوم نے مسجد میں مورتی استھاپت (نصب)
کرکے مسجد کو ناپاک کردیا ہے جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسی رپوٹ کی بنیاد
پر سٹی مجسٹریٹ فیض آباد نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے ملحق گنج شہیداں کو قرق کردیا
اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو رسیور مقرر کرکے مسجد پر تالا ڈالدیا اور
فریقین کے نام نوٹس جاری کردی کہ وہ اپنے اپنے دعویٰ کے سلسلے میں ثبوت پیش کریں۔

اس انتہائی مجرمانہ اور غیر مذہبی حرکت پر پورے ملک میں بے چینی پھیل گئی، چنانچہ جمعیۃ
علماء کے اکابر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی وغیرہ نے وزیر اعظم آنجہانی جواہر لال نہرو کو مطلع کیا
جواہر لال نے وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری پنتھ کو لکھا کہ وہ ضلع مجسٹریٹ کو حکم دیں
کہ مسجد سے مورتی فوراً نکالدی جائے چنانچہ پنتھ نے وزیر اعظم کے حکم کے مطابق ضلع
مجسٹریٹ کو یہ آرڈر بھیجدیا چونکہ ضلع مجسٹریٹ اس سازش میں خود ملوث تھا اس لئے
اس آرڈر پر عمل کرنے کے بجائے اس نے ابھے رام داس وغیرہ کو اطلاع دی اور ان
سے کہا کہ میں اس آرڈر کے نفاذ میں کچھ تاخیر کردوں گا تم لوگ اس درمیان میں

عدالت سے اسٹے حاصل کرلو، ان لوگوں نے اس کے کہنے کے مطابق اس حکم کے خلاف عدالت سے اسٹے حاصل کرلیا، اس طرح مورتی مسجد سے ہٹائی نہ جاسکی، اسی بنیاد پر ضلع مجسٹریٹ کے نائر سے پنتھ جی نے استعفار دے لیا لیکن اس کے بعد پنتھ جی نے اس معاملہ میں دلچسپی نہیں لی اور مورتی اسی جگہ باقی رہی۔

مقدمات کا سلسلہ مورتی رکھنے کے ۲۴ دن کے بعد ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندو فرقہ کے ایک شخص گوپال سنگھ کی طرف سے ظہور احمد، حاجی محمد فائق، حاجی پھیکو، احمد حسین عرف اچھن، محمد سمیع، ڈی ایم، سٹی مجسٹریٹ اور سرکار اترپردیش کو پارٹی بنا کر یہ دعویٰ دائر کیا گیا کہ یہ جنم بھومی ہے ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں، مسلمانوں اور ضلع انتظامیہ نے اس میں رکاوٹ ڈال دی ہے لہٰذا یہ رکاوٹ ختم کر کے ہمیں پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے یاد رہے کہ ۱۸۸۵ء کے دعویٰ میں جو رگھوناتھ داس نے کیا تھا، اس میں مسجد کے باہر چبوترہ کو جنم استھان بتایا گیا تھا اور اسی پر عمارت بنانے کی اجازت چاہی گئی تھی اور اس دعویٰ میں جو نقشہ پیش کیا تھا اس میں مسجد کو "بابری مسجد" ہی کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔

یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کرتے ہوئے اپنے بیان کے پیراگراف ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ میں لکھا ہے، یہ جائداد نزاعی "بابری مسجد" کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمانوں کے ذریعہ عبادت کیلئے استعمال ہوتی چلی آرہی ہے، اس کا استعمال رام چندر جی کے مندر کے روپ میں کبھی نہیں ہوا، ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا، اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا

پیدا ہوگیا اس لئے سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور اسی تاریخ کو ایڈیشنل مجسٹریٹ شری مارکھنڈے سنگھ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اس مسجد کو قرق کر کے ریسیور مقرر کردیا۔ ڈپٹی کمشنر کے جواب دعویٰ سے ایک ماہ پہلے یکم جون ۱۹۵۰ء کو ایس، پی ضلع فیض آباد کرپال سنگھ نے جواب دعویٰ داخل کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ "یہ زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے، اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے۔"

اس مقدمہ کے بعد ہندوؤں کی جانب سے دو مقدمات اور دائر کردئے گئے ایک پرم ہنس رام چندر داس کی جانب سے اور دوسرا نرموہی اکھاڑا کی طرف سے، اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں یوپی سنٹرل وقف بورڈ اور مسلمانوں کی جانب سے ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں جمعیۃ علماء کی طرف سے مولانا نصیر احمد صاحب فیض آبادی بھی مدعی تھے۔ اس دعویٰ میں کہا گیا تھا کہ "یہ بابری مسجد مسلمانوں کی مسجد ہے جس میں وہ ۱۵۲۸ء سے برابر عبادت کرتے چلے آرہے ہیں، یہ مسجد ان کو واپس دی جائے اور نماز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔" اب تک ان تمام مقدموں کی فائل الگ الگ تھیں بغرض سہولت عدالت کے حکم سے انہیں یکجا کردیا گیا اور سنی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۱۲؍۶۱ کو رہنما کیس قرار دیا گیا۔ اسی اثنا میں ریسیور پریہ دت کا انتقال ہوگیا تو عدالت نے انکی جگہ شری کے کے رام، ورما آنریری مجسٹریٹ کو ریسیور مقرر کیا اسی درمیان مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ مسجد میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ اس لئے انھوں نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے الگ کرنے کی درخواست دی مسلمانوں کی شکایت کو صحیح مانتے ہوئے سول جج نے رام ورما کو ریسیور کے عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیدیا، اس حکم کے خلاف

ہندوؤں نے ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ میں "رویژن" دائر کر کے اسٹے لے لیا، اس موقع پر رہنما کیس اور جملہ مقدمات کی فائل، ہائی کورٹ میں طلب کر لی گئی اور فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے، اور تقریباً پندرہ سال کی طویل مدت گذر گئی مگر فیض آباد کی عدالت میں اس مقدمہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی حالانکہ اس مدت میں مسلمانوں کی جانب سے بار بار درخواست پیش کی گئی کہ اس کا فیصلہ جلد کر دیا جائے اور ہائی کورٹ کی طرف سے بھی عدالت فیض آباد کو ہدایت دی گئی کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جلد کر دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔

دوران مقدمہ خلاف قانون مسجد میں تبدیلیاں | گذشتہ سطور سے معلوم ہوا کہ "بابری مسجد" کے چاروں سمت چہار دیواری ہے، مسجد کا صدر دروازہ اتری سمت ہے جس پر موٹے خط میں لفظ اللہ کندہ تھا مگر رسیور اور پولیس کے ہوتے ہوئے اسے کھرچ دیا گیا، اور دروازے پر "جنم استھان مندر" کا بورڈ لگا دیا گیا، احاطہ کی اتری چہار دیواری اور صحن مسجد کی درمیانی خالی جگہ پر سفید و سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنا لیا گیا جسے "پری کرما" کا نام دیا گیا ہے۔ صحن مسجد میں اتر جانب ہینڈ پائپ گاڑ لیا گیا ہے، صحن مسجد سے باہر پورب سمت ایک سفالہ پوش مندر تعمیر کر لیا گیا ہے، اس کے متصل مہنتوں کی قیام گاہ بھی بنا لی گئی ہے، اس چبوترہ پر جسے شروع میں رام جنم استھان کا نام دیا گیا مندر تعمیر کر لیا گیا ہے، اس کے متصل دو مندر اور بنائے گئے، مسجد کے درمیانی گنبد پر جھنڈا لگا دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلیاں سنہ ۱۹۶۷ء سے سنہ ۱۹۶۹ء کے درمیان ہوئیں جبکہ رسیور کا تقرر اس لئے ہوتا ہے کہ متنازع عمارت میں فریقین کوئی ترمیم و اضافہ نہ کر سکیں لیکن یہ سب تبدیلیاں ہوئیں کیوں کہ رسیور رام ورما اور نگراں پولیس جذباتی طور پر سب ان غیر قانونی تبدیلیوں میں باہم شریک کار تھے۔

مسجد مندر بنا دی گئی | ہائی کورٹ بنچ لکھنؤ میں رسیور ورما کے سلسلہ میں داخل رٹ

زیر سماعت ہے اور قانونی طور پر ابھی اس کے خلاف اپیل نہیں کی جا سکتی لیکن ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو رمیش چندر پانڈے ایک غیر متعلق شخص نے جو مقدمہ میں فریق نہیں ہے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ نمبر ۱۹۵۰ء میں ایک نئی درخواست دی کہ جنم استھان میں پوجا پاٹ کی چھوٹ ہونی چاہئے لہٰذا عدالت ضلع انتظامیہ کو حکم دے کہ جنم بھومی کا تالا کھول دے تاکہ ہم اور ہندو لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا کر سکیں، اس پر منصف صدر نے یہ کہتے ہوئے درخواست خارج کر دی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے اس لیے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا، اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے، ایم پانڈے کی عدالت میں سول اپیل نمبر ۱۹۸۶ء ۳۰ جنوری کو داخل کی گئی اور ۳۱ جنوری کو دیوانی کے سرکاری وکیل نرائن دت کھتری پیش ہو گئے ضلع مجسٹریٹ نے ڈی، ایم اور ایس، پی کا بیان لینا چاہا چنانچہ یکم فروری ۱۹۸۶ء کو یہ دونوں حکام بھی حاضر ہو گئے جج نے ضلع مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ اگر مسجد یا جنم بھومی کا تالا کھولدیا جائے تو کیا آپ لا اینڈ آرڈر بحال کر سکیں گے، انھوں نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس فرضی کارروائی کے بعد اسی دن سنیچر کو پونے پانچ بجے جج نے فیصلہ سنا دیا کہ ضلع انتظامیہ تالا کھولدے اور رمیش چندر پانڈے اور دیگر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی کھلی چھوٹ دی جائے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے نیز ضلع انتظامیہ لا اینڈ آرڈر بحال رکھنے کیلئے مناسب کارروائی عمل میں لائے۔ مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کے سلسلے میں تین درخواستیں دی گئیں لیکن جج نے کہا کہ یہ معاملہ ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے اس میں مسلمانوں کو فریق بنانے کی ضرورت نہیں، اور تینوں درخواستیں رد کر دیں

فیصلہ کے فوراً بعد پانچ بجکر ۱۹ منٹ پر بابری مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا، ہزاروں ہندو پوجا کیلئے اسی وقت مسجد میں پہونچ گئے اس طرح ۴۵۸ سال کی قدیم مسجد بیک جنبش قلم مندر میں تبدیل کردی گئی۔ مقدمہ کا پہلو کس قدر ڈرامائی ہے کہ اس میں مدعی رمیش پانڈے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اندر کمار پانڈے، ڈسٹرکٹ جج کے ایم پانڈے، وکیل دیریشور دویدی سبھی سب پنڈت ہیں اس لئے جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے سے ظاہر تھا۔

اسی کا شہر وہی مدعی وہی منصف ہمیں یقیں تھا ہمارا قصور نکلے گا

فیصلہ پر ایک نظر حیرت ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ پونے پانچ بجے ہوتا ہے لیکن اجودھیا اور فیض آباد میں پی، اے، سی دن کے دو بجے ہی لگادی گئی، ان کی زبردست گشت مسلمانوں کے محلوں میں شروع ہوگئی اور فیصلہ سے پہلے ہی عدالت کو پولیس اور پی اے سی نے اپنے حصار میں لے لیا تھا جس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوا پہلے سے طے شدہ سکیم کے تحت ہوا یہ بھی حیرتناک ہے کہ صرف پانچ دن کے اندر منصف عدالت سے لیکر ضلع جج کی عدالت تک مقدمہ کی ساری کارروائی عمل میں آگئی فیصلہ بھی کردیا گیا۔ ہندوستان کی عدالتوں میں کیا مقدمات اسی سرعت سے نمٹائے جاتے ہیں؟ کیا ہندوستانی عدلیہ ایسی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟ پھر جو مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہو اس کی اپیل وہ بھی ماتحت عدالت میں کس قانون و دفعہ کے تحت کی گئی؟ کیا کسی مقدمہ میں فریق ثانی کو نوٹس دیئے بغیر فیصلہ کرنا قانونی رو سے درست ہے؟

آخری بات اسلام اور مسلمانوں پر اس سے بھی سنگین تر حالات آئے ہیں اس لئے مایوسی نامرادی کے بجائے استقلال و استقامت اور حکمت و جرأت سے حالات کا رخ موڑنا ہے، ظلم و جبر کی کشتی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی، کامیابی ہمیشہ حق کا قدم چومتی ہے۔ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

(اقتباس اداریہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مسلم پرسنل لا نمبر۔ رجب شعبان ۱۴۰۶ھ مارچ اپریل ۱۹۸۶ء)

شذراتِ معارف

اجودھیا کی بابری مسجد کا تالا جب سے کھولا گیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جا بجا ایسی خونریز کشیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا جو سبق پڑھایا گیا تھا وہ بالکل بھلا دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اگر ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کا کوئی استاذ یہ ثابت کردے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر بنائی گئی تو ہم مسلمانوں سے اپیل کریں گے کہ وہ اجودھیا جاکر اس کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کردیں۔ کیوں کہ کسی غاصبانہ قبضہ والی زمین پر مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مسلمانوں کیلئے مذہباً ناجائز ہے۔ بنو امیہ کے زمانہ میں ولید بن عبدالملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لئے زمین کی کمی پڑی تو اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی۔ انھوں نے یہ کہکر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو دے نہیں سکتے، زبردستی سے لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہوجائیگا، ولید کو غصہ آگیا اور یہ کہکر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلفائے راشدین کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انھوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے فوراً منہدم کرادیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر ازسرِنو ہو۔ (خطبات شبلی ص۲۷۰) اگر ہندو مؤرخین مستند معاصر تاریخوں سے یہ ثابت کردیں کہ یہ مسجد رام جنم بھومی مندر کی جگہ بنائی گئی ہے تو مسلمان وہی مثال پیش کرنے کیلئے تیار ہیں جو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے پیش کی تھی، مگر

مسلمان غلط قسم کی تاریخی تحقیقات، دورانہ کا رقیبات، گمراہ کن معلومات، حکومت کے بے جا فیصلے، اعصابی جنگ، اخبارات کے پروپیگنڈے سے مطمئن، مرعوب اور مغلوب نہیں ہو سکتے، غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بابری مسجد کو بنے ہوئے چار سو تراسی برس گذر گئے، اس جگہ پر اسکے قائم رہنے کی وجہ سے کیا ہندو مذہب کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی رہی یا ۱۹۴۹ء میں جب اس میں تالا لگا دیا گیا تھا تو اس وقت سے ابتک اس تالابندی سے ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی میں ترقی نہ ہو سکی؟ کیا اس تالہ کھولنے سے ملکی مفاد اور قومی بہاؤ میں رخنہ نہیں پڑا؟

یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنا کہ اب اسکو بنا دیا گیا ہے۔ خود وطن دوست ہندو اس پر سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، کہاں تک صحیح ہے۔ دہلی کے ڈاکٹر آر۔ ایل شکلا نے اپنے ایک مضمون میں ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جس سے رامائن اور رام دونوں کی حیثیت مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "رامائن میں شروع میں صرف چھ ہزار اشلوک تھے، پھر بارہ ہزار اور آخر میں چوبیس ہزار ہو گئے۔ یہ آج تک پتہ نہیں چلایا جا سکا ہے کہ کن کن لوگوں کی طرف سے یہ اضافے ہوتے گئے۔ پھر اشلوک کے ان اضافوں سے تاریخ مرتب کرنا ممکن نہیں، رام چندر جی کا دور مہابھارت سے بہت پہلے اور حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ مہابھارت کی لڑائی حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار سال پہلے ہوئی، پھر رامائن میں جن جگہوں کا ذکر ہے وہاں انسانی آبادی کا نشان ملنا چاہئے، اس کی تلاش میں اترپردیش میں تین جگہوں پر کھدائی ہوئی فیض آباد ضلع میں اجودھیا، پھر الٰہ آباد سے ۲۷ کلو میٹر اتر کی طرف شرنگویر پور اور پھر الٰہ آباد شہر میں بھاردواج آشرم میں ہوئی، آج سے تقریباً پچیس سال

قبل وہاں جو کھدائی ہوئی اس سے وہاں انسانی آبادی کے نشان حضرت عیسیٰ سے چھ سو سال سے اوپر کے زمانہ کے نہیں ملے، پھر دس سال پہلے وہاں جو کھدائی ہوئی تو حضرت عیسیٰ سے سات سو سال پہلے کے کچھ نشانات ملے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام کا شہر تھا اور یہیں انکی جنم بھومی ہے تو رام کا ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ اجودھیا کے پتہ چلائے ہوئے آثار سے پہلے نہیں دکھاتا۔ ڈاکٹر شکلا لکھتے ہیں کہ بودھ کے زمانہ میں اجودھیا میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے نشانات کا تو پتہ چلتا ہے مگر اس سے پہلے کی حکومت اور تہذیب کے آثار کا بالکل پتہ نہیں ہے اس لئے یہ جو لوگ اجودھیا میں کسی جگہ کو رام جنم بھومی بتلاتے ہیں انکی تائید نہ تو تاریخ اور نہ آثار قدیمہ سے ہوتی ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ رامائن کے اجودھیا اور موجودہ اجودھیا میں بڑا فرق ہے، رامائن میں ہے کہ کوسل کا دارالسلطنت اجودھیا سرجو ندی کے کنارے پر ضرور تھا، مگر ندی سے کافی دور ساڑھے تین میل پر تھا، مگر آج کا اجودھیا ندی سے بالکل قریب ہے، رامائن میں یہ بھی ہے کہ سرجو ندی مغرب کی طرف بہتی ہے اور گنگا سے کچھ دور ہے، مگر آج کل یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے اور یہ راپتی میں نہ کہ گنگا میں جا کر ملتی ہے، ڈاکٹر شکلا نے یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ راون اور رام کی لڑائی کا ثبوت بھی کتبے اور آثار قدیمہ سے نہیں ملتا، وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ رامائن میں ذکر ہے شرنگویر پور میں گنگا پار کر کے رام بھاردواج آشرم گئے مگر ان دونوں جگہوں کی کھدائی ہو گئی ہے، جس میں حضرت عیسیٰ سے سات سو سال پہلے کی انسانی آبادی کا پتہ نہیں چلتا ہے — رام چندر جی کی شخصیت اور اہمیت رامائن ہی سے متعین ہوتی ہے، اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں اور نہیں آتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ رامائن کب اور کیسے لکھی گئی؟ آج انچاس برس پہلے اسی رسالہ معارف میں اس پر

بحث چھڑی تھی، رامائن کا تجزیہ کرتے ہوئے راج مندری (دکن) کے مسٹر ملادی دین کنار تنام سابق وائس چانسلر گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مندری نے ایک کتاب "رام مصر کا فرعون" کے نام سے لکھی ہے، اس میں انھوں نے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے کہ جنکو پڑھکر حیرت ہوتی ہے، انکا خیال ہے کہ رامائن ایک مصری فرعون رابیسز ثانی کے قصہ سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا، رامائن کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، رامائن ہی کا بیان ہے کہ یہ نام اس لئے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت انکو پایا تھا، بالفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں، بلکہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، وہاں اب بھی دولتمند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اس کو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے، دین کنار تنام نے اسی طرح رامائن کے اور ناموں کی تطبیق مصری ناموں سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آثار میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت کیا جائے کہ رام چندر جی نے کسی خطہ پر حکومت کی یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ دیدیا گیا ہے، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اس سے ہم کو بحث نہیں، مگر ملادی دین کنار تنام نے اس کی تصنیف کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے ضرور دلچسپی ہے۔

دین کنار تنام کا دعویٰ ہے کہ رامائن میں بودھ مت کے حوالے اکثر جگہ موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکشسوں کو قتل کرنے جا رہے تھے، اور متھلا پہونچے تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوئی، اس

کے معنی یہ ہوئے کہ رام چندرجی گوتم بدھ کے بعد ہوئے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا رامائن کی یہ روایت صحیح نہیں ہے؟ اگر اس میں گوتم بدھ کے لڑکے کا ذکر ہے تو یہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی کی قرار دی جا سکتی ہے، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رام چندرجی حضرت عیسیٰ سے ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تو پھر رامائن ان کے تین ہزار سال کے بعد لکھی گئی جو کتاب کسی معاصر ماخذ یا مستند اثری اور کتبی شہادتوں کے بغیر قلمبند ہوتی ہے اس میں سنی سنائی ہوئی روایتوں کا سہارا زیادہ ہوتا ہے جس میں مؤرخوں کے نزدیک تاریخیت نہیں ہوتی ــــ دین کمار ناتھ لکھتے ہیں کہ خود رامائن میں ہے کہ نرد پہلا شخص ہے جس نے بالمیک کو یہ افسانہ سنایا، اس میں اس نے کیسی رنگ آمیزی کی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالمیک ہندو نہ تھا کوئی بدیسی نو وارد تھا رامائن میں یہ بھی ہے کہ نرد برہما کا بیٹا تھا جسکو رام کا قصہ سنانے کیلئے برہما نے بالمیک کے پاس آسمان سے بھیجا جس کے بعد وہ پھر آسمان کیطرف چلا گیا، مگر رامائن میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ چترکوٹ میں بالمیک اور رام چندر کی ملاقات ہوئی، رام چندرجی نے اپنا جو قصہ سنایا، اسی کو بالمیک نے قلمبند کر دیا، دین کمار ناتھ لکھتے ہیں کہ اس تضاد کا اندازہ خود مؤرخین کر سکتے ہیں دین کمار ناتھ جو چاہیں لکھیں مگر ہندو رامائن کو ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں تو ہم کو ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس پر زیادہ بحث کرنے کا حق نہیں ــــ رامائن میں جو عجیب غریب واقعات لکھے گئے ہیں، دین کمار ناتھ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں بیاں کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت جو نسب نامہ دیا گیا ہے وہ یہ کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشنو تھے، اکش وشنو کے بیٹے دسرتھ تھے جو رام چندرجی کے باپ تھے،

دسرتھ نے ساٹھ ہزار سال تک حکومت کی اور رام چندر گیارہ ہزار برس تخت نشین رہے راون
کے دس سر تھے، رام کا حریف و مقابل راون تھا جو رامائن کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب و غریب
ہے کیوں کہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ
"رو" بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون
اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیوجی بیٹھے ہوئے تھے اکھاڑ کر آسمان
کیطرف پھینکدیا، شیوجی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ
پھر زمین پر آگرا، اور راون کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا، وہ چلانے لگا اور آخر شیوجی نے ترس
کھاکر راون کا ہاتھ نکالدیا، اس وقت سے راون شیوجی کا معتقد ہوگیا اور جب ہی سے "راون"
کہلایا، دس کنٹھ" اور "دس گریو" اس کا لقب ہے، کیونکہ رامائن کے مطابق وہ دس سر والا
انسان تھا اور جب رام چندر جی سے جنگ ہورہی تھی تو اس کا ایک سر کٹنے کے بعد
اس کی جگہ نیا سر پیدا ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ رام چندر جی کی تلوار نے ایک سو ایک سر
کاٹ ڈالے، اسی لڑائی کے ذکر میں ہے کہ بندروں نے رام چندر جی کی حمایت کی اور وہ
ہمالیہ سے پتھر لاتے تھے اور آسمان تک لے جاتے تھے اور سمندر کو ایک جست میں پھاند جاتے
تھے۔ ایسے تمام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے دین کتار نام لکھتے ہیں کہ یہ خلاف عقل
بیانات شاعرانہ تخیل کیلئے تو جائز سمجھے جاسکتے ہیں، لیکن تاریخ کیا افسانہ کے معیار
سے بھی گر جاتے ہیں، پھر اپنی طرف سے یہ کہتا ہے کہ جب ہندو ان باتوں کو سچ سمجھ کر
ان پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں تو ہمارے لئے اس پر جرح و قدح کی گنجائش نہیں
البتہ اس کی طرف خیال ضرور جاتا ہے کہ اگر رامائن کے مطابق راجہ دسرتھ اور
رام چندر جی کی حکومت اکہتر ہزار سال رہی تو پھر عام روایت جو یہ ہے کہ ان کا

زمانہ حضرت عیسیٰ سے پچیس ہزار سال پہلے تھا، تو دونوں کی حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے انکا عہد حضرت عیسیٰ سے چھیانوے ہزار سال پہلے رکھنا ہوگا۔

وین کنار تنام یہ بھی لکھتے ہیں ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی چیز ایسی نہیں پیش کر سکتے جس کو رام چندر جی کی یادگار کہا جا سکے، چتر کوٹ، رام کوٹ، رام ٹیک، پنچ وٹی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گذرگاہ ہونے یا قیام کا شرف حاصل ہوا ہے، سوائے ان مندروں کے جو عقیدتمندوں نے بعد میں تعمیر کر دیئے ہیں بلکہ اکثر مقامات کا وقوع بھی مشتبہ ہے، کیوں کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں کے دو چار مقامات پر رام کا گذرنا مروی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کیطرف ہٹا ہوا ایک اور مقام "پرنا سالہ" نامی بھی رام کی قیامگاہ بتائی جاتی ہے پرنا سالہ اور پنچ وٹی یہ دونوں مقام وہ ہیں جہاں کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا۔ یہ دعویٰ ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے جنکو رام کے سفر و حضر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

وین کنار تنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ دسرتھ کی ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو کے کنارے واقع تھی اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا جس کو خود منو نے آباد کیا تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کیلئے تھی، یہاں ایسے ایسے آلات حرب موجود تھے جو ایکدم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل، بہت سی منزلیں اور عمارتیں اس کی رونق تھیں، اجودھیا کا یہ شہر دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وین کنار تنام لکھتے ہیں کہ شہر اجودھیا کی عظمت، خوبصورتی اور استحکام کا جو ذکر ہے اسکے لئے گواہی دینے والی ایک اینٹ

بھی موجود نہیں، اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدھسٹوں نے آکر نو آبادی قائم کرلی ہو اور اسی سے رام کی روایت ملک میں پھیل گئی۔

رامائن پر اس قسم کی تنقیدیں ہندوؤں کو ضرور ناگوار گذریں گی مگر یہ ہندوؤں کی ہی لکھی ہوئی ہیں اس لئے وہ غور و فکر کی دعوت ضرور دیتی ہیں اور اگر رامائن میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو وہ اپنے سینے سے لگائے رکھنا ہی پسند کرتے ہیں تو اسمیں کسی قسم کی مداخلت کی ضرورت بھی نہیں، وہ رامائن کو ایک مقدس کتاب اور اجودھیا کو ایک پوتر استھان ضرور سمجھیں مگر خدارا اجودھیا کی کسی تاریخی چیز اور خصوصًا بابری مسجد کو غلط قسم کے تاریخی حوالے دیکر اس کو اس طرح متنازع فیہ نہ بنادیں جس سے ملکی مذہبی اور جذباتی ہم آہنگی خطرہ میں پڑ جائے اور ملک میں ہر طرف نفرت کی آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی دے۔ (معارف اعظم گڑھ جلد ۱۳۷، عدد ۳، جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ مارچ ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد

مظلوم بابری مسجد | تاریخ ہند میں بابری مسجد، شاید وہ پہلی مسجد ہے جس کے صحن میں تقریبًا سو مسلمان شہید ہوئے ہیں، سیکڑوں علماء، وصلحاء، معرکہ کارزار میں اپنوں کی چیرہ دستیوں سے کام آئے۔ اس مسجد سے ارباب عزیمت کی ایک ایسی تاریخ وابستہ ہے، جس سے بے ساختہ دل کہہ اٹھتا ہے۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔

اجودھیا دنیا کی وہ قدیم ترین آبادی ہے جو حالاتِ زمانہ کے ہاتھوں کئی بار تباہ ہوا اور آباد ہوا، قدیم تاریخ نگاروں کے بیان کے مطابق یہیں منی پربت کے دامن میں ایک احاطہ ہے جس میں حضرت شیثؑ کے علاوہ حضرت ایوبؑ اور آپکی زوجۂ مطہرہ جو حالتِ مرض میں ساتھ تھیں، ان کا مزار ہے، حضرت شیثؑ کے مزار کو آج بھی ہندو

شیث ناگ کالنجر کا مزار کہتے ہیں حضرت سید بن حام بن نوح کا بھی مزار ہے جو نوگزی قبر سے مشہور ہے، یہیں اجودھیا میں سید موسیٰ عاشقین کی خانقاہ تھی جہاں سے علم و معرفت کے دریا بہتے تھے۔

بابر بادشاہ نے ہندوستان پر سب سے پہلے ۹۲۵ھ میں حملہ کیا، مسلسل چار حملوں کی ناکامی کے بعد ۹۳۲ھ تخت شاہی دہلی پر فائز ہو گیا، ۹۳۵ھ میں وہ اودھ کی طرف آیا اور یہاں شیخ بایزید کی شورش کو ختم کیا۔ شیخ بایزید کی شکست کے بعد میر باقی تاشقندی کو اودھ کا حاکم مقرر کیا اور خود اپنی فوجوں کے ساتھ کوچ کر گیا، میر باقی تاشقندی نے اپنے آقا کی یادگار کے طور پر ۹۳۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں ایک پرتی زمین پر مسجد کی تعمیر کی۔ اس مسجد میں جو سنگی تختی نصب ہے، اس میں صاف طور پر لکھا ہے (ترجمہ) "بحکم شہنشاہ بابر جس کا انصاف چرخ گردوں تک وسیع ہے، نیک دل میر باقی نے فرشتوں کے اس آشیاں کو تعمیر کر دیا، یہ خیر ہمیشہ باقی رہے، اس مسجد کا تاریخی نام بود خیر باقی" ہے۔
۹۳۵ھ

مسجد کی موجودہ حالت | مسجد کے پورب کچھ دور کے بعد راستہ اور بیراگیوں کے مکانات ہیں، پچھم جانب راستہ اور دو فرلانگ سے کچھ آگے جلال الدین گوجری کا پختہ مزار ہے، جس پر مولانا شاہ عبدالحق ردولوی آ کر مراقبہ کیا کرتے تھے، اتر جانب پختہ سڑک ہے، دکھن جانب قاضی قدوہ کا مزار ہے، انھیں کی اولاد کو قدوائی کہتے ہیں جو بارہ بنکی و فیض آباد کے اضلاع میں عموماً پائے جاتے ہیں، اسی مزار اور مسجد کے درمیان ایک کنواں ہے جس کے قریب میں گنج شہیداں ہے، مسجد کے احاطہ میں داہنی جانب پیپل کا ایک درخت

ہے پورب کی جانب جو مسجد کا اصل دروازہ ہے صحن سے پہلے وضو کرنے اور جوتا اتارنے کی جگہ ہے۔

جب ہندوستان میں انگریزوں کی دخل اندازی ہوگئی تو انھوں نے ہندو مسلم لڑائی پیدا کرنے کیلئے اجودھیا میں بھی ایک سازش کی، اسی سازش کے نتیجہ میں ہندو لوگ نواب واجد علی شاہ کے زمانہ میں اسی جوتا اتارنے اور وضوگاہ کے حصہ میں بائیں طرف ایک مورتی رکھدی اور کہنے لگے کہ یہ ہمارے رام جی کا جنم استھان ہے جس پر مسلمانوں کیطرف سے بہت احتجاج کیا جانے لگا، واجد علی شاہ کے زمانہ میں صحن مسجد اور اس جگہ کے درمیان ایک دیوار قائم کردی گئی تاکہ بیراگی اندر نہ جاسکیں۔ اس دیوار میں نمازیوں کیلئے ایک دروازہ بنادیا گیا۔ یہ ہے اس مسجد کا مختصر تعارف جس میں ۹۳۵ھ سے ۱۹۴۹ء تک مسلسل اللہ کی عبادت ہوتی رہی، درمیان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ بھی آیا۔ اگر اس میں کچھ حقیقت ہوتی تو اس کے زمانہ میں جنم استھان کا افسانہ ضرور کھڑا کیا گیا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ بابر نے جنم استھان رام جی کو کھدوا کے یہ مسجد تعمیر کی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، بابر تو ایک دریادل اور ہر مذہب ملت کی پاسداری کرنیوالا انسان تھا، وہ کب گوارا کرسکتا تھا کہ کسی کے معبد یا جنم استھان کو کھود کر وہاں مسجد تعمیر کرے، نہ تو اس کی اجازت اسلام دیتا ہے اور نہ ہی بابر نے ایسا کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہندوستان نے ۱۹۴۶ء میں ایک کتاب لکھی جس میں لکھتے ہیں کہ بابر نے شہزادہ محمد ہمایوں کو نصیحت کی — اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹادو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان

کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرسکو گے پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہیگی جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا، اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے الخ

(عہد مغلیہ ہندو مورخین کی نظر میں مرتبہ سید صباح الدین ص۲۳۴)

ان تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ بابر نے جنم استھان کو کھدوا کے وہاں یہ مسجد تعمیر کی بالکل غلط ہے۔ یہ تاریخ بیانی نہیں، تاریخ سازی ہے جسکی مذمت ہر قیمت پر کیجائیگی۔

شاہ غلام حسین کی مجاہدانہ سرگرمیاں اور مخالفین کی سازشیں

۱۲۷۱ھ نواب واجد علی شاہ کا یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب حضرات دین سے بیزار اپنے عشرت کدوں کو آباد کئے ہوئے تھے انگریز ان کے دماغ پر حاوی ہوچکا تھا۔ ہندو مسلم لڑائیں طرح طرح کی سازشیں کی جارہی تھیں، نواب کو اس کی اطلاع دی گئی، لیکن وہ مسلمانوں کی کب سنتے، مجبوراً ایک صاحب عزیمت بزرگ شاہ غلام حسین اور بھی اپنے چند جاں نثاروں کو لیکر میدان میں آگئے گومتی کے قریب قیام کیا، ساتھ میں مولانا محمد صالح، احسان علی خاں، رستم علی خاں اور دیگر کچھ غریب مسلمان تھے۔ شاہ صاحب اجودھیا ہوکر بابری مسجد میں مقیم ہوگئے تقریباً تین ماہ قیام رہا، ہر وقت فکرمند رہتے کہ مسجد کے پاک کرنیکی کوئی سبیل نکل آئے، ادھر ادھر لوگوں کو دوڑایا مگر کسی نے ساتھ نہ دیا، ایک دن بیراگیوں سمیت راجہ مان سنگھ کے کارندے اور قرب وجوار کے تقریباً ۱۲ ہزار لوگ ہنومان گڑھی میں جمع ہوگئے اور چاہتے تھے کہ ان سب مسلمانوں کو جو سو کے قریب ہیں ختم کردیا جائے لیکن ان مجاہدین کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، بروز جمعہ ۱۲ ذی القعدہ کو یہ لوگ بھی لڑنے مرنے کیلئے تیار ہوگئے، اسی دوران نثار حسین نائب

کوتوال جو نہایت عیار اور بدطینت تھا اور الگزنڈر آر انگریز ناظم اودھ دونوں نے ملکر بیچ بچاؤ کرادیا یہ معاملہ اتنی دیر تک چلا کہ بیچارے مسلمان نماز جمعہ بھی نہ ادا کر سکے دوسرے دن ۱۳ ذوالقعدہ کو جان ہرسی انگریز ایک سازش لیکر لکھنؤ سے فیض آباد آیا، نثار حسین کوتوال، الگزنڈر آر اور جان ہرسی تینوں نے جاکر مسلمانوں سے کہا کہ مسجد میں چونکہ دروازہ نہیں لگا ہے اس لئے مناسب ہے کہ بازار سے ایک دروازہ لاکر نصب کرلیں تاکہ دفعۃً آپ پر کوئی حملہ نہ کر سکے، شاہ صاحب ان کی عیاری سے ناواقف تھے، فوراً دو آدمیوں کو بیگم پور محلہ میں دروازہ خریدنے کے لئے بھیجدیا جب یہ لوگ مسجد کیطرف دروازہ لانے لگے تو کچھ بیراگیوں نے انھیں گھیر لیا، مسجد سے رستم علی خاں، بہادر علی خاں، میاں فقیر بخش، بہادر خاں، کل سات آدمی چلائے جلوتہ پر پہونچے ادھر ادھر سیکڑوں آدمی ہوگئے، یہ حضرات بھرپور مقابلہ کرکے لڑتے لڑتے گڑھی کے دروازہ تک پہونچ گئے، راجہ مان سنگھ کے لوگوں نے مسجد کے قریب خوب کشت وخون کیا، اچانک بارش آگئی، مسلمانوں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا، اسی وقت دونوں انگریز بھی آگئے اور کہنے لگے کہ اب آپ لوگ اطمینان سے رہیں کچھ نہ ہوگا، یہ کہکر انگریز گئے ہی تھے کہ چاروں طرف سے بیراگی مور وملخ کیطرح آکر مسجد کو گھیر لئے، تلواریں سُتی ہوئیں، آنکھیں غضبناک وہ تین سو آدمی بم جھادیو اور ہر ہر کرتے ہوئے مسجد میں گھس گئے، بیچارے مسلمان تھوڑے، کئی دن کے بھوکے پیاسے مجبوراً مدافعت کے لئے تیار ہوئے، صحن مسجد ہی میں خون خرابہ ہوا، تمام مسلمان شہید ہوگئے۔ مجاہدوں کے خون سے مسجد لالہ زار ہوگئی، مسجد کے نہریوں سے برسات کے

پانی کی طرح خون بہ پڑا۔ قرآن کی خوب بے حرمتی کی گئی، کچھ کو جلایا گیا، شہیدوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی رہیں، دوسرے روز نثار حسین کوتوال نے مسجد کے دروازہ سے دکھن ایک بڑا گڑھا کھدوا کر اس میں ان شہیدوں کو پاٹ دیا، آج یہی جگہ گنج شہیداں کہی جاتی ہے ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ ان کی تاریخ شہادت بلغ العلےٰ بکمالہ سے برآمد ہوتی ہے۔

مولانا امیرالدین کی داستان عزیمت

مسجد کی ناقابل بیان بے حرمتی ہوئی، اندرون مسجد ہوم کیا گیا، سنکھ بجائے گئے، موہن بھوگ کھایا گیا، مسجد کے قریب خواجہ ہٹی نامی ایک ٹیلہ تھا جس پر پرانے شہداء کی قبریں تھیں اسے کھود کر برابر کردیا گیا اور وہاں ایک مندر تعمیر کردی گئی۔ جب یہ اطلاع لکھنؤ پہونچی تو مسلمان بے چین ہو گئے، غیور علماء تڑپ گئے، علماء فرنگی محل میں مولانا عبدالرزاق مولانا المعان الحق، مولانا حسام الحق، مولانا تراب علی، مولانا [illegible] الحق، مولانا حیدر علی، خورشید حسین اور چند حضرات نے خدا کا گھر واگذار کرنے کے ارادہ سے فرنگی محل سے نکل کر امیٹھی کی طرف کوچ کیا، لکھنؤ میں کہرام مچ گیا، نواب واجد علی نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر یہ غیور انسان نہ رکے، امیٹھی میں مولانا امیرالدین صاحب سے انکی ملاقات ہوئی انکی غیرت ایمانی پہلے سے جوش میں تھی، سب لوگوں نے انکے ہاتھوں پر بیعت کی اور قافلہ روانہ ہوگیا۔ نواب کی اعانت سے محروم رہے۔ رشوت خور حکام نے انھیں الٹا مجرم ٹھہرایا، ایک شدید شورش دیہاتوں تک پہونچ گئی۔ نواب کے وزیر مملکت علی نقی خاں شیعی نے ایک حیلہ سے مفتی محمد یوسف

وغیرہ کو ان علماء کی خدمت میں بھیجا کہ ان سب کو لکھنؤ بلالائیں ہم اس واقعۂ ہائلہ کا تدارک کردینگے، امیر المجاہدین نے مولانا عبدالرزاق اور چند علماء فرنگی محل کو شاہ اودھ کے پاس بطور سفارت گفتگو کیلئے بھیجدیا اور خود سہالہ جاکر قیام کیا۔ علی نقی خاں سے مولانا عبدالرزاق صاحب کی گفتگو ہوئی، مولانا نے امیر المجاہدین کی منظوم عرضی پیش کی جس میں واقعہ کربلا کی یاددہانی تھی۔ جہاد کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ وزیر مملکت کے بغل میں بیٹھے جبہ ودستار پہنے ایک سرکاری مولوی نے فرمایا، واقعی کتب فقہ میں جہاد کا فرض عین ہونا دیکھا نہیں گیا؟ مولانا نے فرمایا سبحان اللہ! آپکو شرح وقایہ کی یہ عبارت یاد نہیں وَفرضُ عینٍ اِنْ ہجمُوا فتخرجُ المرأۃُ والعبدُ بلا اذنٍ، اس پر سرکاری مولوی کو بات نہ بن پڑی پھر کہنے لگے کہ اگر فرض ہے تو اولوالامر منکم کی شرط جو قرآن میں ہے، آپ کے پاس کہاں؟ نواب صاحب تو آپ کے ساتھ نہیں ہیں، مولانا نے جواب دیا ہمارا اب کوئی امیر نہیں۔ لکھنؤ کو نہ ہوگیا ہے، اس پر وزیر برہم ہوگیا۔ اس سفارت کے نتیجہ میں وزیر نے وعدہ کیا کہ ہم بادشاہ سے اجازت لیکر اس کا تدارک فوراً کردیتے ہیں اگر آپ ایک ماہ ٹھہریں۔

مولانا مقبرہ امجد علی شاہ والی مسجد میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک ماہ تک انتظار کرتے رہے۔ لیکن یہ وزیر کا ایک حیلہ تھا، انہوں نے تدارک کی بات نہ سوچی بلکہ شہر کی ناکہ بندی کرادی تاکہ کوئی نکل نہ پائے اور ایک شاہی لشکر مع انگریزی فوج کے مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے بھیجدیا گیا۔ ۱۹ ذوالحجہ ۱۲۷۱ھ کو مولانا بمعیت براہ سندیلہ اٹیٹھی روانہ ہوئے۔ مولانا امیرالدین صاحب جب نواب سے مایوس ہوگئے تو آپ نے بابری مسجد اجودھیا کا رخ کیا، ادھر نواب صاحب کے فرستادے رمضان علی،

تہور خاں، بہادر رسالدار وغیرہ نے امیر المجاہدین کے پاس پہونچکر ان کو ایک حیلے سے دریاباد میں روک لیا، یہیں راجہ مان سنگھ اجودھیا کے تین جاسوس فقیرانہ صورت میں آئے۔ مولانا مسیح الزماں صاحب نے انھیں پکڑ کر سختی سے پوچھا تو انھوں نے جاسوسی کا اقرار کیا اور معافی کے لئے ہاتھ پیر جوڑنے لگے تو مسلمانوں نے معاف کر دیا، اسی درمیان نواب کا بھیجا ہوا علمائے زردست کا ایک گروہ آدھمکا جس میں سید العلماء میرن شاہ مجتہد، سلطان العلماء میر سید مجتہد، مولوی سعد اللہ، مفتی محمد یوسف وغیرہ تھے، ان لوگوں نے قافلہ میں آکر مباحثہ شروع کر دیا اور ہر طرف لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کا نعرہ بلند کرنے لگے مگر یہ مردان باخدا ان کی باتوں میں نہ آئے اور کچھ دن کے بعد اجودھیا کیطرف دریاباد سے ۲۰ صفر ۱۲۷۳ھ بروز جمعرات بعد نماز فجر چل پڑے کہ راستے ہی میں نواب کی بھیجی ہوئی انگریزی فوج نے گھیرا، مولانا بہت متفکر ہوئے اور قافلے کو چار حصہ کرکے ہر ایک حصہ کو ایک فرسخ کے فاصلے سے چلنے کی ہدایت کی چنانچہ اس ترتیب سے سارا قافلہ روانہ ہو گیا اور انگریزی فوج کو پتہ نہ چلا، انگریز بوکھلا گئے، فوراً شیخ حسین علی کو جو ایک غدار شخص تھا ان کے تعاقب میں بھیجا اور ہدایت کر دی کہ ان سب کو کسی نہ کسی حیلے سے محمد پور میں روکے رکھیں، اس نمک خوار نے مسلمانوں کا خیر خواہ بنکر ان کو شجاع گنج میں روک لیا یہاں تک کہ ۶ ہم صفر ۱۲۷۳ھ بروز بدھ انگریزی فوج نے شجاع گنج کے میدان میں مجاہدین کو گھیر لیا، انگریزی فوج مسلح آلات حرب سے لیس تھی، اس نے جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں، دوسری طرف مجاہدین بھوکے پیاسے نہتے اپنی بوسیدہ تلواریں لئے ہوئے ظہر کے وقت جنگ شروع ہوئی، عصر تک ان مجاہدین نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے

دراں کی توپ و تفنگ پر قبضہ کرلیا، لیکن وائے بدقسمتی، مجاہدین زخموں سے چور، کئی دن کے بھوکے ہیں کہ اچانک ان پر راجہ مان سنگھ کی تازہ دم فوجوں نے حملہ کردیا، نڈھال مسلمان کب تک لڑتے، گھمسان کی جنگ ہوئی، شجاع گنج کے نالوں میں پانی کی جگہ خون بہ پڑا، امیر المجاہدین مع اپنے جانثاروں کے شہید ہوگئے، عین معرکہ میں امیر المجاہدین سے کہا گیا کہ آپ نکل کر نکل جائیں تاکہ آئندہ مقابلہ کی نوبت آسکے، انھوں نے یہ مصرعہ پڑھا "سر میدان کفن بردوش دارم" اور جام شہادت نوش کیا، بعد میں لوگوں نے ان کی تاریخ شہادت نکالنی چاہی تو مجاہد کی زبان کا نکلا ہوا یہی مصرعہ تاریخ بن گیا، اس معرکہ میں دو عورتیں بھی شہید ہوئیں۔

آخری بات | گویا چار سو سال سے زیادہ اس مسجد میں خدا کی عبادت ہوتی رہی اور کوئی تاریخی واقعہ اس میں نزاع کی صورت حال کی روداد نہیں سناتا، چار سو سال کے بعد کچھ شر پسندوں نے رام جنم استھان کا شاخسانہ تصنیف کیا، اور نا عاقبت اندیش حکمرانوں کی غفلت نے اس فتنہ کی آبیاری کی، مگر غیور مسلمانوں کی جرأت ایمانی نے پھر اس عبادت خانہ کو محفوظ کردیا — اب تقریباً پانچ سو سال سے مسلسل خدا کی عبادت کا یہ مقدس گھر دوبارہ بے سروپا تاریخی من گھڑت روایات کی بنیاد پر نزاعی مقام بن رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں اس کو مقفل کیا گیا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے وقت میں جمعیۃ علمائے ہند کی زیر نگرانی مقدمہ دائر کیا گیا پھر مقدمہ کی پیروی وقف بورڈ نے شروع کردی، ابھی مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے لیکن ضلع مجسٹریٹ نے تمام تاریخی حقائق اور ملک کی سالمیت سے آنکھیں بند کرکے

ایسا فیصلہ کردیا جس سے عقل و دانش سرگریباں ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس طرح کے فیصلوں سے ہندوستان کی عدلیہ کا اعتماد متزلزل ہو رہا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ قانون کا دور ہے اور قانون برادران اسلام کے حق میں ہے۔ انشاءاللہ حق کی فتح ہوگی اور تقریباً ۵۰۰ سال سے خدا کی عبادت کا یہ مقدس گھر پھر اسی کی عبادت کیلئے وقف ہوگا۔ (مضمون کے مآخذ و مراجع! نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی صاحب۔ تذکرہ علماء ہند بیان مولانا امیر الدین صاحب امیٹھوی، تذکرہ علماء فرنگی محل بیان مولانا عبدالرزاق صاحب، حدیقۃ الشہداء گم گشتہ حالات اجودھیا فارسی، عہد مغلیہ ہند و مورخین کی نظر میں) جمیل الرحمن القاسمی پرتاپگڈھی (دارالعلوم دیوبند)

(اقتباس از آئینہ دارالعلوم، دیوبند۔ یکم جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ، ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء)

سلطان بابر پر مندر توڑ کر مسجد بنانے کا الزام جھوٹا

سابق کانگریسی وزیر داؤ دیال کھنہ کا یہ مطالبہ کہ رام جنم بھومی اجودھیا، کرشن جنم بھومی متھرا اور وشوناتھ مندر بنارس ہندوؤں کو واپس لوٹائی جائے محض فرقہ واریت کو ہوا دینا اور مذہبی منافرت پیدا کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور اسی طرح کی دیگر فرقہ پرست جماعتوں کے افراد اور لیڈر بھی ان کے اس گندے منصوبے میں انکا ساتھ دے رہے ہیں جو کسی حالت میں اس جمہوری اور سیکولر ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ ہندوستان سیکڑوں برسوں سے مختلف مذاہب کے لوگوں کا گہوارہ چلا آرہا ہے اور مختلف تہذیبیں اس ملک میں پلتی رہی ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے قبل اس ملک کی سرزمین پر ہندو مسلم

فساد ہونے کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اس سے قبل ایک ریاست کی دوسری ریاست سے اقتدار کیلئے جنگ کثرت سے ہوئی ہے۔ ہندو راجاؤں کی فوجوں میں مسلمان کثرت سے سپہ سالار اور سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے اور مسلمان بادشاہوں کی فوجوں میں ہندو سپہ سالار اور سپاہی رہتے تھے اور یہ لوگ اپنے حکمرانوں کا پوری دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ ساتھ دیتے تھے۔ اکبر اعظم کی حکومت کو مستحکم بنانے میں راجہ مان سنگھ، ٹوڈرمل، بیربل اور دیگر راجپوتوں نے نمایاں رول انجام دیا ہے۔ اسی طرح شیواجی اور پیشوا باجی راؤ کی فوج میں مسلمان سپاہی پیش پیش رہے ہیں۔ انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کو مضبوط بنانے اور ہندو مسلم طبقہ میں نفرت پیدا کرنے کی غرض سے کچھ تعصب میں ڈوبی ہوئی تاریخی کتابیں لکھوا کر نصاب تعلیم میں شامل کیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس ملک پر حکومت کرنیوالے مسلمان بادشاہ ظالم و جابر اور ہندو مندر توڑنے والے ہندوؤں کے قاتل تھے جبکہ مسلم حکمرانوں کی انصاف پروری ہندو دوستی کی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس حقیقت کا اعتراف سبھی انصاف پسند مؤرخوں نے کیا ہے۔ سر جدو ناتھ سرکار، ایشوری پرشاد، ڈاکٹر تارا چند جیسے مؤرخوں نے بابر، ہمایوں اور اکبر کی مذہبی رواداری کی تعریف کی ہے۔ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے لکھا ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کو مذہبی تعصب سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی اس نے ہندو رعایا کی دلجوئی کیلئے گئو کشی پر پابندی لگانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ پھر یہ مان لینا کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اس ملک پر مسجد تعمیر کرا دی ، بہت بڑی حماقت ہے۔ رام چندر جی ہندوؤں کے مقدس رہنما ہیں۔ بابر مذہب اسلام کا کٹر پابند تھا۔ بانیٔ اسلام

حضرت محمد صلعمؐ کی تعلیم کے مطابق کسی بھی فرقہ کے معزز افراد کی تعظیم کرنا واجب ہے
ایسی صورت میں بابر اپنے مذہبی رہنما کی تعلیم سے انحراف کر کے مندر کیسے توڑ سکتا تھا
اگر وہ ایسا کرتا تو اس پر اپنا محل، قلعہ وغیرہ بنوا سکتا تھا۔ مسجد ہرگز نہ تعمیر کرواتا کیونکہ
مسجد کے بارے میں مذہب اسلام کا یہ بہت ہی واضح اصول ہے کہ وہ پاک وصاف
زمین پر تعمیر ہونی چاہیئے، کسی کی زمین غصب کر کے اس پر مسجد تعمیر کرنا ناجائز ہے۔
اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنے پر نمازی ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ شریعت کی اس
واضح ہدایت کو جانتے ہوئے بابر ایسا غلط ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ رام مندر کو توڑ کر
مسجد بنانے کا الزام لگانا تاریخی حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ اس طرح کا الزام لگانے والے
ہندوستان کو مذہبی جنگ کی آگ میں جھونکنا اور مسلم ملکوں کے ساتھ اسکے دوستانہ
تعلقات کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک تاریخی اور دستاویزی ثبوت کا سوال
ہے بھگوان شری رام، بھگوان شری کرشن اور بھگوان شیو کسی کا بھی سن پیدائش تاریخی
کتابوں سے ثابت نہیں۔ یہ سبھی رہنما پورانک مہاپرش ہیں۔ بکرمی سمت سے ہزارہا
سال قبل یہ اس ملک کی سرزمین پر ہوئے ہیں۔ بالمیکی رامائن، مہابھارت، وشنو
پران، بھگوت گیتا، ہنومان چالیسا، تلسی رامائن جیسی مقدس کتابیں بھی ان مہاپرشوں
کے جنم کے بارے میں خاموش ہیں۔ گوسوامی تلسی داس جی تو اکبر اعظم کے دور حکومت
میں ہوئے تھے۔ اگر بابر نے رام جنم بھومی کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کروائی تھی تو کم
سے کم گوسوامی جی کو اپنی رامائن یا دیگر کتابوں میں اس کا ذکر کرنا چاہیئے تھا۔ انگریزی
دور حکومت میں متعدد دانشور، مفکر، مورخ، مذہبی اور سیاسی رہنما ہوئے۔
کم از کم ان رہنماؤں کو ہی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن

سوامی دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، رام کرشن پرم ہنس، راجہ رام موہن رائے، لوک مانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال، دیش بندھو چترنجن داس، پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، بابو شیو پرشاد گپتا، چکرورتی راج گوپال آچاری، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، منشی پریم چند، ڈاکٹر سمپورنا نند، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، مرارجی ڈیسائی، چودھری چرن سنگھ، سردار پٹیل جیسے منصف مزاجوں میں سے کسی نے بھی اپنی تحریر سے بابری مسجد کے رام جنم بھومی ہونے کی شہادت نہیں دی جبکہ بابری مسجد کا وجود ۹۳۵ھ سے اب تک ثابت ہے مسجد کی تعمیر کی بابت جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے اس کا سن تعمیر ۹۳۵ھ ثابت ہے کتبہ کے مطابق بابر کے جرنیل میر باقی نے اس کو تعمیر کرایا تھا "بود خیر باقی" سے اس کا سن تعمیر نکلتا ہے۔ یہ مسجد وقف بورڈ میں ۱۹۳۶ء سے درج ہے اور مسلمان اس مسجد میں ۱۹۴۹ء تک برابر نماز ادا کرتے رہے ہیں۔ جے۔ این اُگرہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اپنے حلف نامہ میں کہا ہے کہ یہ جائداد بابری مسجد کہی جاتی ہے۔ اور ایک زمانہ سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس سے شری رام چندر جی کے مندر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی دھوکہ دھڑی سے اس مسجد میں رکھدی گئی۔ اس وجہ سے امن وامان کو خطرہ پیدا ہوا اس لئے حکام کو مداخلت کرنی پڑی۔ جے۔ این اُگرہ کا یہ حلف نامہ مسجد اور مندر کے مقدمہ کے سلسلہ میں فیض آباد کی عدالت میں داخل ہے جسے دیکھا جاسکتا ہے۔ مسجد میں مورتی رکھے جانے کے خلاف اکشے برہم چاری نے آمرن انشن بھی رکھا تھا۔ ہنومان گڑھی کے مہنت اشکے رام داس نے

۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو خود اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ انھوں نے اپنے چیلوں کے تعاون سے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام اور سیتا کی مورتی مسجد میں رکھوائی تھی۔ فیض آباد میں تعینات کلکٹر کے۔ کے نایر نے مہنت جی کو اس کام میں تعاون دیا تھا۔ اپنے اسی کارنامہ کی وجہ سے کے نایر کو ہندو فرقہ پرستوں میں اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی کہ وہ بہرائچ سے ایم۔ پی کا الیکشن جیت گئے۔ بعد میں ان کی بیوی سوشیلا نایر بھی اسی علاقہ سے کئی بار ایم۔ ایل۔ اے ہوئیں۔ جس مسجد میں گووند بلبھ پنت کے دور حکومت میں تالا لگایا گیا اور جس کا مقدمہ ۳۵ برسوں سے عدالت میں چل رہا ہے اس کی ملکیت کا تصفیہ ہوئے بغیر اس میں ایک فرقہ کو داخلہ کی اجازت دیکر ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہونے کا موقع کیوں دیا گیا۔ نصف درجن رام جانکی رتھوں کو ملک کے مختلف علاقوں میں آزادانہ طور پر گھومنے اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی چھوٹ کس کے اشارہ پر دی گئی؟ آر ایس ایس، شیو سینا، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل کے لیڈروں کو زہر افشانی کا موقع کیوں فراہم کیا گیا؟ کیوں نہیں ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی گئی جبکہ حکومت کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس طرح کی چھوٹ امن وامان کیلئے خطرناک ثابت ہوگی۔ امن وامان کو خطرہ لاحق نہ ہو اس کے لئے حکومت سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل میں مجبوری ظاہر کرتی ہے۔ جیسا کہ روشن پورہ کے شیعہ سنی مقدمہ کے فیصلہ سے واضح ہے جبکہ یہ صرف مسلمانوں کے دو فرقوں کے بیچ کا معاملہ ہے۔ لیکن جو مسئلہ پوری دنیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الجھا سکتا ہو اس کو صوبائی حکومت نے معمولی سمجھ کر کیسے نظر انداز کر دیا۔ اور سرکاری وکیل نے اور صوبائی حکومت نے

لا کھولے جانے کے سول جج کے فیصلہ کے خلاف حکم امتناعی کیوں نہیں حاصل کیا۔
و ہندو پریشد کے صدر سابق جسٹس شیونا تھ کاٹجو، گورکھ ناتھ مندر کے مہنت اویدناتھ
یر اعلیٰ اتر پردیش شری ویر بہادر سنگھ کے آپس میں کیا تعلقات ہیں۔ سرکاری
یل جج اور ضلع انتظامیہ اور اومیش چند پانڈے کا اس میں کیا رول رہا۔ ان
ب واقعات کی سپریم کورٹ کے جج کے ذریعہ تحقیقات کرائی جائے اور مسجد و مندر
کا تصفیہ جنوبی ہندوستان کے ہائی کورٹ کے دو ججوں کے ذریعہ فوراً کرایا جائے تاکہ
لک میں مزید کشیدگی پیدا نہ ہو۔ بابری مسجد کے متعلق ثبوت فراہم کرنے کے لئے فیض
باد گزیٹیر، فیض آباد سے سٹیل منٹ کمشنر لی کور کی تصنیف اسٹوریکل اسکیچ آف
فیض آباد ۱۸۷۰ء کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے ثبوت فیض آباد کے سرکاری ریکارڈ
روم سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کے دفتر میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لندن کے
انڈیا آفس میں بھی اس کی بابت فرمان دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسجد کا فارسی کتبہ خود بھی
اس کی شہادت کیلئے کافی ہے۔ جہاں تک مسلمان بادشاہوں کی حکومت کا سوال ہے۔
محمد غوری کے عہد ۱۱۹۲ء سے لیکر بہادر شاہ ظفر کے دور ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں
نے اس ملک پر سیکڑوں سال تک حکومت کی ہے۔ اگر یہ لوگ واقعی مندر شکن اور
ہندو مذہب کے دشمن ہوتے تو ایک بھی قدیم مندر آج ہمیں دیکھنے کو نہ ملتا۔ مندر توڑے
جانے کا الزام ان بادشاہوں پر بہتان تراشی ہے۔ اس کے برعکس مندروں کی تعمیر اور
ان کے رکھ رکھاؤ کیلئے ان بادشاہوں کے جاری کردہ فرمان آج بھی مختلف
مندروں کے مہنتوں کے پاس دیکھے جا سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر رمیش پرشاد گرگ آتش سکریٹری ہندی اردو ساہتیہ سنگم اے ۲/۲۵-۲ سلیم پورہ وارانسی)

(سیاست کانپور ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء دوشنبہ)

بابری مسجد سے پہلے وہاں کوئی مندر نہ تھا

بابری مسجد سے پہلے وہاں کوئی مندر تھا تو اس کا ذکر تاریخ اور انگریزوں کے دور حکومت کے گزیٹیوں میں کیوں نہیں کیا گیا۔ پچھڑی ذاتیں اور ہریجن رام جنم بھومی کے مسئلہ پر فرقہ پرستوں کے بہکاوے میں نہ آئیں۔ بابا امبیدکر کے زیر اہتمام ریزولیشن کانفرنس الٰہ آباد کی تاریخی قرارداد۔ بابا بھیم راو امبیدکر مشن کے زیر اہتمام بمقام کورل کلب الٰہ آباد میں ۱۳، ۱۴ر فروری کو تاریخی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پورے صوبہ کے ہریجن اور پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے رہنما و دانشوروں نے شرکت کی۔ ۱۳ تاریخ کی صدارت جناب جسٹس شمس الاسلام جعفری نے فرمائی۔ ۱۴ر فروری کے اجلاس کی صدارت جناب الحاج ذوالفقار اللہ سابق مرکزی وزیر مالیات نے فرمائی۔ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے جناب تہور اکیش سابق ایم پی نے کہا کہ بابری مسجد بنام رام جنم بھومی کا تنازعہ حقیقت سے کوسوں دور ہے اور حکمراں پارٹی کی سرپرستی میں آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کی ایک زبردست ملک دشمنی پر مبنی سازش ہے بابری مسجد سے قبل وہاں کوئی مندر تھا تو اس کا ذکر تواریخ اور انگریزوں کے دور حکومت کے گزیٹیر میں کیوں نہیں ہے، گزیٹیر تو مغلوں نے نہیں بلکہ مغل دور حکومت کے سخت ترین دشمن انگریزوں نے تیار کیا تھا جبکہ انگریزوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہندو مسلم کو لڑانا تھا۔ اس اجلاس میں پانچ قراردادیں پاس ہوئیں۔ ان میں کی ایک قرارداد یہ ہے "یہ اجلاس مختلف سیاسی تنظیموں، اقلیتوں، پچھڑی ذاتوں اور ہریجن سے اپیل کرتا ہے کہ وہ آپس میں اکیتا بنائیں، رام جنم بھومی کے مسئلہ میں فرقہ پرست طاقتوں کے بہکاوے میں ہرگز نہ آئیں

کیونکہ آر ایس ایس اور ہندو وشو پریشد جیسی تنظیمیں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ (سیاست کانپور دوشنبہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء)

وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل والے کیا چاہتے ہیں

آر ایس ایس کی ایک شاکھا وشو ہندو پریشد نے کافی عرصہ سے شری رام جنم بھومی تحریک ملک کے طول و عرض میں چلا رکھی ہے اب اسی کی ایک اور شاکھا بجرنگ دل نے شہر کی دیواروں پر اشتعال انگیز نعرے لکھ کر طلبا کو اس تحریک میں شامل ہونے اور اسکولوں کالجوں کو بند کرنے کی اپیل کی ہے۔ کیا اس سے فرقہ واریت کو بڑھاوا نہیں ملے گا۔ جب شری رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے، عدالتوں کے نظام میں یقین نہیں رکھتے؟ کیا انھیں جمہوری نظام میں اعتماد نہیں ہے؟ کیا وہ سیکولر ملک ہندو ملک بنانا چاہتے ہیں۔ جب ہائی کورٹ میں مقدمہ موجود ہے تو انھیں عدالت کے فیصلہ کا انتظار کرنا چاہئے۔ سڑکوں پر تحریک چلا کر یا عوامی جذبات کو مشتعل کر کے جائداد کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ بھگوان شری رام کب اور کس مقام پر پیدا ہوئے ان کا اصل محل کس جگہ پر تھا ابھی اس سوال کو لیکر دانشوروں اور عالموں میں اتفاق نہیں ہے جبکہ بابری مسجد کا ثبوت تاریخ کے صفحات سے ثابت ہے۔ ۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دیکر سلطنت مغلیہ کی داغ بیل ڈالی اس کے بعد رانا سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا کو شکست دیکر اپنی حکومت کو تقویت بخشی۔ بابر نے ہی اجودھیا میں بابری مسجد تعمیر کرائی۔ بابر کے بعد ہمایوں، شیر شاہ، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر تک سبھی مسلم حکمرانوں کے زمانہ میں یہ مسجد

نماز ادا کرنے کے کام میں آتی رہی۔ جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ملکہ وکٹوریہ
کنگ ایڈورڈ، جارج پنجم اور جارج ششم حکمراں ہوئے ان کے زمانہ میں بھی بابری
مسجد مسلمانوں ہی کے انتظام و انصرام میں رہی اور جب ہندوستان ۱۹۴۷ء میں
آزاد ہوا تو رام جنم بھومی کے پجاری نے ایک ہندو کلکٹر نایر کو اپنی سازش میں
کر کے بابری مسجد میں مورتی رکھوا دی۔ اس پر ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی حکومت
اتر پردیش نے مسجد پر تالا بند کر دیا۔ اس وقت سے اس کا مقدمہ عدالت میں چل
رہا ہے۔ کیا اس حقیقت سے کوئی بھی انصاف پسند انکار کر سکتا ہے۔ پھر بلاوجہ
سنگھ سارے ہندوؤں کو گمراہ کر کے نفرت کیوں پیدا کی جا رہی ہے۔ کیا وشو ہندو پریشد
کے لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس تحریک کے نام پر جو کروڑوں روپیہ چندہ کیا گیا ہے اس
سے غریب ہندوؤں کی کیا امداد کی گئی۔ کتنے ہریجن سماجی تفریق سے تنگ آ کر
مسلمان اور عیسائی بنتے جا رہے ہیں۔ وشو ہندو پریشد نے ان کے لئے کیا کیا۔
مذہبی جذبات کو بھڑکانا اچھا کام نہیں ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بالا جی دیورس،
وکرم ساورکر، ہراج مدھوک، بال ٹھاکرے کی اپیلوں سے مشتعل ہو کر ہندوستان
کے ہندو بابری مسجد اجودھیا، گیان باپی مسجد بنارس، عیدگاہ متھرا یا چند
اس قسم کی دیگر مسجدوں پر قبضہ کر کے مندر میں تبدیل کر دیتے ہیں تو
اس سے ہندوؤں کو کیا فائدہ ہو جائیگا یا ہندوستان کا وقار دنیا میں کتنا اونچا ہو جائیگا
کیا بھارت کے مسلمان اسکو خاموشی سے برداشت کر لیں گے، دنیا کے مسلم
ملکوں میں اس کا اثر نہیں پڑے گا، کیا بنگلہ دیش، انڈونیشیا،
ملیشیا، پاکستان، افغانستان، سعودی عرب، مصر، ترکی وغیرہ

عرب، کویت، مراقش وغیرہ دنیا کے ۴۰ مسلم ملکوں میں رہنے اور کام کرنیوالے ہندوؤں اور وہاں موجود ہندو مندروں کیلئے خطرہ نہیں پیدا ہوگا۔ کیا ایسی صورت میں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، آر ایس ایس، شیوسینا اور ہندو مہاسبھا کے لوگ ان ملکوں میں جاکر ہندوؤں کا تحفظ کر سکیں گے؟ اگر نہیں تو پھر اس طرح کی دیوانگی سے کیا فائدہ؟ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے یہاں سبھی مذہب و مسلک کے لوگوں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل ہے۔ پڑوسی مسلم ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں۔ عرب ملکوں سے ہم پٹرول اور دیگر مالی امداد بھی حاصل کرتے ہیں۔ ملک کے مفاد میں بہتر یہی ہے کہ اس طرح کی تحریکیں سڑکوں پر نہ چلائی جائیں جو جھگڑا عدالت میں چل رہا ہے اسے عدالت ہی میں طے کیا جائے۔

(اقتباس از مضمون ڈاکٹر رمیش پرشاد گرگ کوتلہ بازار بنارس)

یہ مضمون بابری مسجد کا تالا کھلنے سے پہلے لکھا گیا۔ قومی موجہ نمبر ۳ ۲ فروری ۱۹۸۶ء

بابری مسجد کی بربادی کی کہانی

مہاتما گاندھی کے چیلے، سچے ہندو اور سچے دیش بھگت سوامی اکشئے برہمچاری فیض آباد کانگریس کے جنرل سکریٹری اور خاص اجودھیا شہر کے رہنے والے ہندو رہنما نے بابری مسجد سے متعلق جو میمورنڈم ۲۰ فروری سنہ ۱۹۵۰ء کو یوپی گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج کیا جا رہا ہے۔

اجودھیا اور فیض آباد کے واقعات اور بابری مسجد کا مسئلہ محض ایک مسجد یا مندر کا مسئلہ یا محض ہندو اور مسلمان کا جھگڑا نہ سمجھنا چاہئے۔ ان جھگڑوں کے پیچھے دراصل وہ رجعت پسندانہ سازش ہے جس کا مقصد کانگریس اور

مہاتما گاندھی کے بلند اصولوں کی بیخ کنی ہے ..... ان سازشوں میں مقامی حکام بھی شریک رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فیض آباد اور اجودھیا میں ایک قسم کی نراجی صورت پھیلی ہوئی ہے ان رجعت پسندانہ عناصر کا حملہ خود میری ذات پر تین مرتبہ ہو چکا ہے، ایک دفعہ میرے گھر میں گھس آئے اور مجھ کو مارا ..... جب گنج شہیداں اور دوسری قبریں جو بابری مسجد کے قریب تھیں مجموعی طور پر کھودی جا رہی تھیں اور ان کی جگہ ایک چبوترہ تیار کیا جا رہا تھا اس کے متعلق چند معزز مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضی دفعہ ۱۴۵ تعزیرات ہند کے مطابق دی گئی لیکن حکام نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ آج اجودھیا میں دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند نافذ کر دیا گیا اور مسجد پر ۱۴۵ کی رو سے گورنمنٹ نے قبضہ کر لیا ہے لیکن ان احکامات کی برابر خلاف ورزی کی جا رہی ہے ......

اسٹار ہوٹل ایک مسلمان کی ملکیت تھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس ہوٹل کی عمارت کو زبردستی خالی کرالیا اور اسے ایک دوسرے شخص کو دیدیا جس نے گومتی ہوٹل کے نام سے ایک دوسرا ہوٹل کھول دیا ....

گذشتہ ۱۳ر نومبر ۱۹۴۹ء کو مجھے معلوم ہوا کہ بابری مسجد سے متصل قبروں کو مجموعی طور پر کھودا جا رہا ہے۔ میں نے خود جا کر دیکھا قبریں کھودی جا رہی تھیں اور قبرستان کے وسط میں ایک پرانی بنیاد پر جسے مسلمان لوگ قناتی مسجد کہتے ہیں ایک چبوترہ بنایا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر خوف وہراس طاری تھا، مسلمانوں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے حالت کو سنبھالنے کی نیت سے دفعہ ۱۴۵ تعزیرات ہند کی رو سے ایک درخواست سٹی مجسٹریٹ کو دی تھی کہ ایسے افعال سے نقض امن کا اندیشہ ہے لہٰذا انھیں روک دیا جائے لیکن اس پر کوئی

کارروائی نہیں کی گئی۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تنہائی میں گفتگو کی۔

۱۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کی رات کو میرے مکان میں تین آدمیوں نے گھس کر مجھے زدوکوب کیا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ جو باتیں میرے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے درمیان تنہائی میں ہوئی تھیں انھیں حرف بحرف ان لوگوں نے دہرایا اور بعد میں دوسرے لوگوں سے بھی کہا۔ بابری مسجد کے سامنے جہاں قبریں کھودی گئی تھیں وہاں نوروز تک رامائن کا پاٹھ ہوتا رہا۔ اور بھوجن بھنڈارے بہت دنوں تک ہوتے رہے۔ بڑی بڑی سبھائیں ہوتی رہیں۔ تانگوں اور موٹروں میں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ مشتہر کیا گیا کہ رام چندرجی کی پیدائش کی زمین کو واپس لیا جارہا ہے، یگیہ ہو رہا ہے، درشن کیلئے میلوں باہر سے لوگ موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے جن میں جوش سے بھرے ہوئے لکچر دیئے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ بابری مسجد کو شری رام مندر بنانا ہے۔ ... رامائن کا پاٹھ ہوتے وقت سرکاری حاکموں کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پرانی قبروں اور مسلمانوں کے متبرک مقامات مٹائے گئے اور ان جگہوں پر شیوجی کی مورتی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں نصب کردی گئیں۔ اسی طرح منظم طور پر زہر پھیلایا گیا۔ حکام کے رویہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا تو سرکار کی مرضی سے ہو رہا ہے یا سرکار نے فرقہ پرستوں کے سامنے اپنے کو ڈال دیا ہے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو جس کی شب میں بابری مسجد میں رام چندرجی کی مورتی رکھی گئی تھی قریب نو بجے مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انھیں شری بھائی لال کے ذریعہ تقریباً چھ بجے صبح کو معلوم ہوا کہ مسجد میں مورتی رکھدی گئی ہے اسے دیکھنے گیا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مسجد میں

جہاں پولیس کا پہرہ تھا۔ ان پہرہ داروں میں کسی کو خبر نہ ہو سکی اور بھائی لال کو اتنے
سویرے اطلاع مل گئی اور یہ کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بات کی جانچ کی ضرورت
نہیں محسوس ہوئی کہ بھائی لال کو اتنے سویرے یہ خبر کیسے ملی۔

میں تقریباً بارہ بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہمراہ بابری مسجد میں گیا جہاں مورتی رکھی
ہوئی تھی تھوڑے آدمی مسجد کے پاس جمع تھے اس وقت آسانی سے مسجد کی حفاظت
کی جا سکتی تھی اور مورتی کو ہٹایا جا سکتا تھا لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو مناسب
نہیں سمجھا۔ صبح ہی لاؤڈ اسپیکر سے منادی کی جانے لگی کہ بھگوان ظاہر ہوئے ہیں ہندو
درشن کیلئے چلیں۔ موٹروں پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ درشن کیلئے آنے لگے، مجمع میں
پر جوش تقریریں ہوتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ کانگریس ہندو دھرم کو برباد کر رہی
ہے پاکستان میں ایک بھی مندر نہیں رہ گیا ہے پھر اجودھیا میں مسجد اور قبرستان
کیوں رہنا چاہئے ہم لوگوں کو مل کر اجودھیا سے مسلمانوں کا نشان مٹا دینا چاہئے
یہ تب ہی ممکن ہے کہ کانگریس کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اجودھیا میں اکثر پجاری
اور سادھو بھی پرشاد کو نہیں رہنے دینا چاہئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے قہقہوں
کے درمیان یہ نعرے لگائے جاتے تھے۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے جلسوں میں کانگریسی
حکومت کو دھمکی دی اور کہا کہ یہاں مسجد نہیں ہو سکتی۔ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ
کے باوجود سرکاری اجازت کے بغیر ان لوگوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے رہے
اور جلسے ہوتے رہے۔ دفعہ ۱۴۴ کی پابندی صرف مسلمانوں تک ہی محدود
تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ بابری مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیئے گئے تھے کہ

روز تک اجودھیا میں مسلمانوں کا داخلہ روک دیا گیا لیکن ہندوؤں میں جھوٹے جوش پھیلانے کیلئے یہ حرکتیں کی تھیں اس دفعہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ باوجودیکہ بابری مسجد پر گورنمنٹ نے حسب دفعہ ۱۴۵ قبضہ کر لیا تھا لیکن اس پر پوجا پاٹھ جاری رکھا گیا اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔ یہ معلوم رہے کہ اس سے پہلے چار مرتبہ فرقہ وارانہ فسادات فیض آباد میں ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کو جانی و مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں لیکن گورنمنٹ کیطرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ گذشتہ بقرعید کے موقعہ پر جسطرح مسلمانوں کے مکانات لوٹے اور جلائے گئے اور انھیں پیٹا گیا اور عورتوں بچوں پر وحشیانہ طریقہ سے حملہ کر کے گھائل کیا گیا وہ اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ حکومت کو یہ سب معلوم ہے لیکن افسوس کہ گورنمنٹ کیطرف سے عدم کارروائی کیوجہ سے شرارت پسندوں کی ہمت بڑھتی گئی اور مسلمان اپنے آنسو پی کر خاموشی اختیار کرنے کیلئے مجبور ہو گئے۔ آنریبل ہوم منسٹر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں گھائل مسلمانوں اور ان کے لٹے ہوئے اور جلے ہوئے مکانوں کو خود آکر دیکھوں گا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

آج فیض آباد اور اجودھیا میں مسلمانوں میں بہت زیادہ خوف و ہراس طاری ہے اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے یہاں بھیج دیا ہے اور کچھ لوگ اپنے خاندان سمیت ترک وطن کر گئے ہیں۔ میں نے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی توجہ اسطرف مبذول کرنے کیلئے کی لیکن میں ناکام رہا۔ اس طرف یہ پتہ چلا ہے کہ اجودھیا کے مسلمان پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ بابری مسجد ہندوؤں کا مندر ہے۔ اس کے لئے دھمکی بھی دی جا رہی ہے۔

دکانداروں کو دوکان خالی کرنے کیلئے مجبور کیا جا رہا ہے ان سے ترک موالات کا پروپگنڈہ ہو رہا ہے۔ کچھ معزز مسلمانوں پر حملہ کر کے گھائل کیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے میرے مکان موقعہ جانکی گھاٹ اجودھیا کا تالا توڑ کر سب سامان لوٹ لیا گیا ہے مکان پر قبضہ کر کے کچھ لوگ رہنے لگے ہیں وہاں جلسوں میں پرچار کیا گیا ہے کہ میں اجودھیا میں داخل نہ ہو سکوں اور جو ہندو مجھے دیکھنے کے بعد مجھ پر حملہ نہ کرے وہ گئو ہتیا کا گنہگار ہوگا وغیرہ میں اس مسئلہ کو مسجدوں یا مسلمانوں کی حفاظت کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ میرے پیش نظر کانگریس اور مہاتما گاندھی کے وہ بہت بلند اصول ہیں جن کے لئے ہم اب تک لڑتے رہے ہیں اگر ہم نے اپنی پوری طاقت سے ان رجعت پسند خیالات کا تدارک نہ کیا تو کانگریس کا نصب العین ختم ہو جائیگا۔ اور عوام میں رجعت پسند خیالات کا پرچار ہونے لگے گا۔ میں لیڈروں اور سرکار کا دھیان اجودھیا کی حالت کی طرف موڑ کر یہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں کی صورت حال کو سنبھالیں۔ حملہ کرنے والوں اور ان کی مدد کرنیوالے سرکاری حکام کے خلاف سخت کارروائی کرکے مسلمانوں کو محسوس کرا دیں کہ وہ ایسے ملک میں ہیں جہاں انکی جان اور ان کا مال محفوظ ہے۔ ان کے عبادت خانوں اور متبرک مقاموں کو واپس کرکے ان کے مذہبی جذبات کی حفاظت کریں..... ایسے معاملات میں خاموش رہ کر اپنی رضامندی نہ ظاہر کرنی چاہئے۔

۲۰ فروری ۱۹۵۰ء

(اکشے برہمچاری ممبر پردیش کانگریس کمیٹی وسکریٹری ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی فیض آباد)

ہفت روزہ نئی دنیا دہلی۔ ۴ مارچ ۱۹۸۶ء

۱۸۸۵ء کی عدالت سے ۱۹۸۵ء کی عدالت تک

۱۹۴۹ء میں فرقہ پرست عناصر نے بابری مسجد کے اندر مورتی رکھ کر دعویٰ کیا کہ مسجد رام جنم بھومی ہے اور ۱۸۸۵ء میں مہنت رگھوبر داس نے دعویٰ کیا تھا کہ مسجد سے باہر کا چبوترہ جنم استھان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مسجد کے جنم بھومی ہونے کا دعویٰ سراسر لغو اور شرارت پر مبنی ہے۔ عدالتی دستاویزات کی روشنی میں ملک کی کسی بھی عدالت میں اسے کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

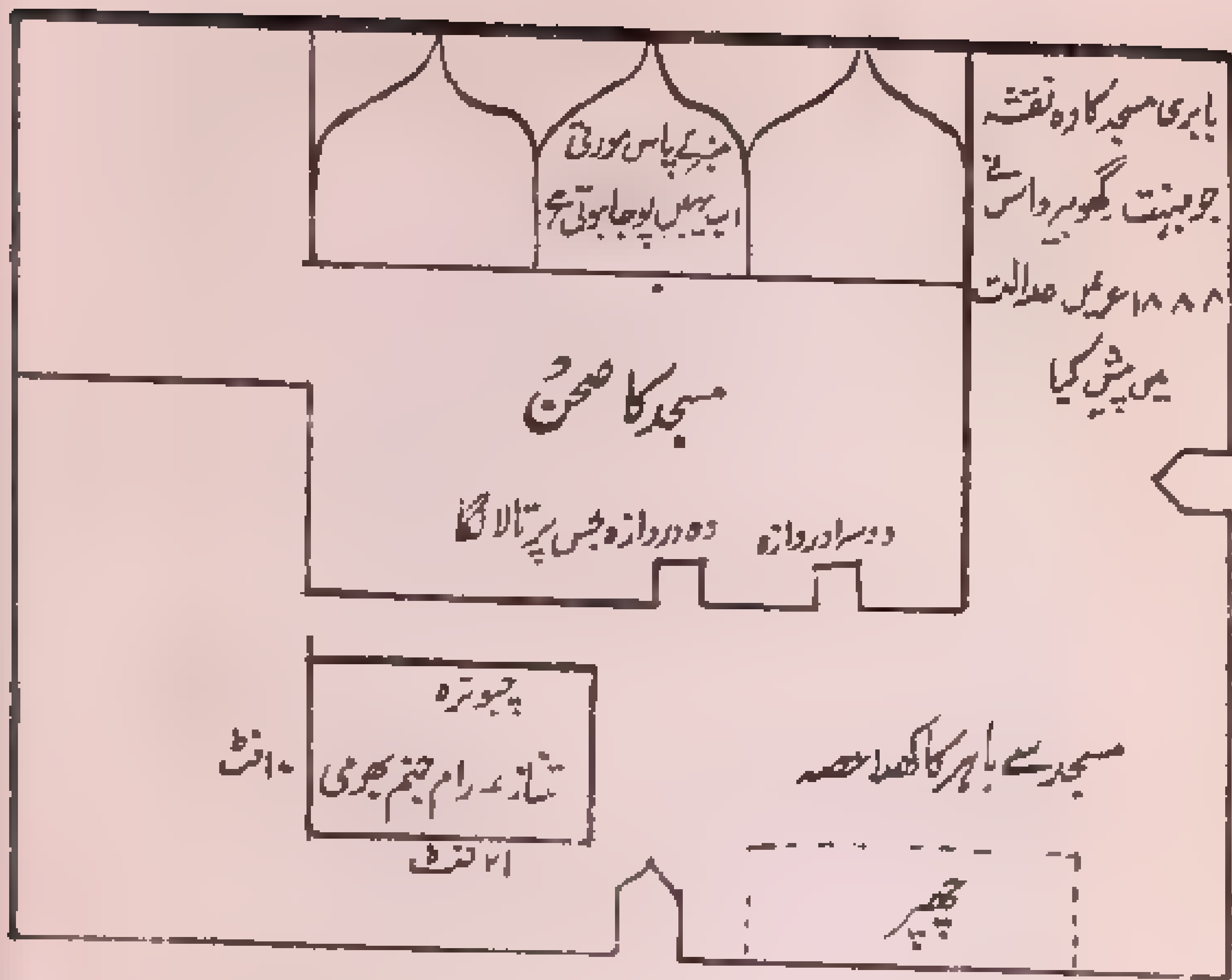
بابری مسجد کا عدالتی تنازعہ ایک صدی سے زیادہ کا ہے۔ اس صدی کے دوران ۶۲ سال تک یعنی ۱۹۴۷ء تک رام جنم استھان اور بابری مسجد دو علیحدہ علیحدہ زمین کے قطعات تھے۔ ایک قطعہ زمین پر بابری مسجد ہے جس کی تعمیر ۱۵۲۸ء میں ہوئی۔ اور دوسرا قطعہ بابری مسجد کے جنوبی مشرقی حصہ کی طرف ایک چبوترہ ہے جو ۲۱ فٹ × ۱۷ فٹ ہے۔ یہ قطعہ زمین ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق رام جنم استھان تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد اچانک اس چبوترہ نے جگہ بدل کر پوری بابری مسجد کو اپنے میں شامل کر لیا۔ یہ بات بڑی حیرت ناک اور پراسرار ہے کہ ۱۹۴۹ء کی سنگین رات میں مقامی انتظامیہ کی سازش سے مسجد میں مورتی رکھ کر اسے بھی متنازعہ بنا دیا گیا اور اب پوری مسجد رام جنم استھان کہی جا رہی ہے اور اس چبوترہ کو سب بھول گئے جس پر ایک سو سال سے رام جنم استھان ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ یہ افسانہ نہیں ہے بلکہ عدالتی کاغذات اس کے گواہ ہیں۔ فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن کی عدالت میں ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اس چبوترہ والے رام جنم استھان کے سلسلہ میں ایک فیصلہ سنایا گیا تھا جس میں مدعی مہنت رگھوبیر داس کو اس

چبوترہ پر مندر بنانیکی اجازت سے انکار کر دیا گیا تھا۔ اس مقدمہ میں رگھوبیر داس نے بابری مسجد کے متولی محمد اصغر اور سکریٹری آف اسٹیٹس فار انڈیا یعنی برطانوی حکومت کو مدعا علیہ بناتے ہوئے عدالت سے اپیل کی تھی کہ اس چبوترہ پر پختہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ یاتریوں کو یہاں ہر موسم میں تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور یہ جگہ ہندوؤں کیلئے بہت مقدس ہے۔ مہنت رگھوبیر داس نے اس جگہ پر اپنا قبضہ و اختیار دکھایا تھا۔ اس مقدمہ میں عدالت نے موقعہ و محل کا معائنہ بھی کیا اور امین کے ذریعہ مکمل پیمائش کے ساتھ اس جگہ کا نقشہ بھی بنایا تھا جس میں دونوں مقامات بہت واضح طور پر دکھلائے گئے ہیں۔ مقدمہ میں مدعی کے وکیل دیوی پرشاد تھے اور سرکار کی جانب سے وکالت پنڈت بشمبر ناتھ کر رہے تھے دوسرے مدعا علیہ محمد اصغر کا وکیل بھی موجود تھا مگر عدالتی فیصلہ میں اس کا نام موجود نہیں ہے۔ فاضل جج نے بہت باریک بینی کے ساتھ مقدمہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھا۔ مدعی کے دعویٰ ملکیت۔ مدعا علیہ کے اعتراضات دونوں کی اچھی طرح چھان پھٹک کی تھی۔

۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کو سب جج فیض آباد پنڈت ہری کشن نے یہ فیصلہ سنایا کہ چبوترہ جو رام جنم استھان سمجھا جاتا ہے مہنت رگھوبیر داس کے قبضہ و اختیار میں ہے عدالت نے یہ بھی تسلیم کیا کہ چبوترہ پر شری رام چندر کی مورتی نصب ہے اور اس کا چڑھاوا مہنت رگھوبیر داس کے پاس ہی جاتا ہے، اس جگہ کا مسجد سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایک پکی دیوار کے ذریعہ مسجد کی حدود کو اس جگہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حالیہ تنازعہ سے کافی پہلے ۱۸۵۶ء میں اس جگہ ہندو مسلمان دونوں عبادت کرتے تھے اور اس سوال پر ان میں

جھگڑا ہو گیا تھا تو حکومت کی طرف سے دونوں جگہوں کو علیحدہ علیحدہ کرنے کے لئے دیوار تعمیر کرا دی گئی تھی تاکہ مستقبل میں ایسے جھگڑے نہ ہوں اور مسلمان مسجد کی چہار دیواری کے اندر عبادت کر سکیں۔ اس لئے یہ چبوترہ اور اس سے ملحق زمین ہندوؤں سے تعلق رکھتی ہے اور مدعی کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس جگہ پر جو رام جنم استھان کہی جاتی ہے مندر بنانے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟ یہ جگہ چاروں طرف سے مسجد کی باہری دیوار سے گھری ہوئی ہے۔ اس دیوار پر لفظ اللہ بھی کندہ ہے اگر ایسی جگہ پر چبوترہ پر مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے تو لازماً مندر کی گھنٹیوں اور شنکھ کی آوازیں بھی بلند ہوں گی۔ نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کے آنے جانے کا راستہ بھی ایک ہی ہے۔ اگر ہندوؤں کو تعمیر کی اجازت دی گئی تو کبھی نہ کبھی روز ایسا فساد ہو سکتا ہے جس میں ہزاروں جانیں جا سکتی ہیں، اسی خدشہ سے ماضی میں امن وامان کے ذمہ دار افسران نے اس جگہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت دینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے یہ عدالت بھی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس جگہ مندر تعمیر کرنے کی اجازت دینا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دو علیحدہ علیحدہ مذہبی فرقے ہیں قتل وغارتگری کی بنیاد رکھنا ہوگا۔ اس لئے اس جگہ کسی نئی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کرتی ہے۔ یہ فیصلہ فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن کا ہے۔

(اقتباس، ہفت روزہ "اخبار نو" دہلی، ۷ مارچ ۱۹۸۶ء)



بابری مسجد سے متعلق چندر شیکھر کی صاف گوئی

جنتا پارٹی کے قومی صدر شری چندر شیکھر نے رانچی میں اخباری نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ پانچ سو برس پرانی بابری مسجد کو حکومتی مشنری کے سہارے مندر کی شکل میں کھولنے کی کیا ضرورت تھی ملک میں تشدد پھیلانے کیلئے جان بوجھ کر حکومت نے یہ کام کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر کوئی ان کے حقوق کو چھیننا چاہے تو وہ اسے چھیننے نہ دیں۔ جنتا پارٹی کے لیڈر ریاض الحق انصاری نے شری چندر شیکھر کے بیان کا زبردست خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے بیان میں کہا کہ پارلیمانی چناؤ کے بعد جب شری چندر شیکھر سے اخباری نامہ نگاروں نے کہا کہ آپ اقلیتوں کی بات

کرکے چناؤ ہار گئے تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ مہاتما گاندھی نے تو اقلیتوں کے لئے اپنی جان گنوادی میں تو صرف چناؤ ہارا ہوں ۔ شری چندر شیکھر نے جس ہمت، بے باکی اور صاف گوئی سے بابری مسجد کو اکثریتی فرقہ اور سرکاری مشینری کے ذریعہ چھیننا قرار دیا ہے اس سے ان کو ہندوستان کے ایک بہت بڑے طبقہ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن وہ مصلحت کو کسی کھلی سچائی پر ترجیح نہیں دے سکتے ۔

شری چندر شیکھر کی اس حق گوئی کا فرقہ پرستوں پر جو ردعمل ہوا ہے وہ آر۔ایس ایس کے ترجمان ۱۶ مارچ کے ہفتہ وار پانچ جنیہ میں اس طرح سامنے آیا ہے اخبار لکھتا ہے کہ رام جنم بھومی کے دروازہ کھولنے کے خلاف جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری اور کٹر پنتھی مسلمانوں کے خود ساختہ لیڈر شہاب الدین جو تحریک چلا کر دیش کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونکتے چلے جا رہے ہیں اس کے سلسلہ میں جنتا پارٹی کے صدر شری چندر شیکھر کہتے ہیں کہ شہاب الدین جو کر رہے ہیں اس کا [illegible] کو حق ہے اپنا مذہبی حق حاصل کرنے کے لئے وہ جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں حالانکہ اس کو جنتا پارٹی کا پروگرام نہیں کہا جا سکتا ۔ لیکن رانچی کے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے شری چندر شیکھر اس وقت اچانک بھڑک اٹھے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا شہاب الدین جو کام اپنے مذہبی حق پر کر رہے ہیں یہی کام ان کی پارٹی میں رہتے ہوئے اگر کوئی ہندو ہندوؤں کے لئے کرتا ہے تو ان کا یہی نظریہ ہوگا؟ یہ سوال سنکر وہ غصہ میں آگئے اور بولے کہ ہر جگہ اقلیتوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور انھیں حاصل ہونا ہی چاہئیں ۔ حکومت یا اکثریتی ہندو اسے چھیننا چاہے تو انھیں بھی حق ہے کہ وہ انھیں چھیننے نہ دیں ۔ شری چندر شیکھر کا کہنا ہے کہ

اجودھیا میں گذشتہ پانچ سو برسوں سے بابری مسجد تھی۔ اور ۱۹۴۹ء سے اس جگہ پر نماز نہ ہو رہا تھا تو سرکاری مشینری کے سہارے اسے مندر کی شکل میں کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔ حکومت نے جان بوجھ کر ملک میں تشدد پھیلانے کے لئے یہ کام کردیا ہے اور ایسی صورت میں شہاب الدین اگر کسی تحریک کی قیادت رہے ہیں یا اس میں شامل ہوتے ہیں تو انھیں کیسے روکا جاسکتا ہے؟

(ضیاء الحق انصاری)

(روزنامہ قومی مورچہ بنارس ۱۶ مارچ ۱۹۸۶ء)

رام جنم بھومی سے متعلق چند بنیادی سوالات

۱۔ بالمیکی کی لکھی ہوئی رامائن (سنسکرت) اور سنت تلسی داس کی "رام چرت مانس" (دادھی) ایک ہی داستان پر مشتمل ہیں یا ان کے متن اور کرداروں میں بنیادی اختلافات ہیں؟

۲۔ سنت تلسی داس نے "رام چرت مانس" مغل دور حکومت (بابر کے بعد اور اکبر کے زمانہ میں) لکھی تھی۔ کیا اس عظیم مصنف نے شری رام چندر کی جائے پیدائش کی کوئی نشاندہی کی ہے؟

۳۔ شری رام چندر ایک دیو مالائی کردار ہیں یا ایک زندۂ جاوید تاریخی حقیقت؟

۴۔ اگر شری رام چندر ایک زندہ حقیقت ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انھوں نے بن باس سے واپس آکر شاید سیکڑوں سال حکومت کی تھی جو عدل و انصاف کا "رام راجیہ" دور کہا جاتا ہے۔ کیا اس دور میں انھوں نے بہت سے محلات اور

مندر تعمیر کئے گئے تھے؟ اگر کئے گئے تھے تو ان کے آثار کہاں کہاں اور کیا کیا ہیں؟ یا پورے دور میں صرف ایک تعمیر پر اکتفا کی جسے بعد میں منہدم کر کے اس پر بابری مسجد تعمیر کی گئی؟

۵۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ان تعمیرات کو بعد میں مختلف بیرونی حملہ آوروں، بشمول مسلم حملہ آوروں نے تاخت و تاراج کر دیا تھا تو پھر آج بھی سارناتھ کا مندر، سانچی کا استوپ، اشوک کی لاٹ، کھجوراہو اور اجنتا ایلورا کی نقاشیاں کیونکر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں؟

۶۔ اگر بابری مسجد رام چندر جی کے مندر کے باقیات پر تعمیر کی گئی تھی تو دور مغلیہ کے مکمل خاتمہ کے بعد برطانوی دور کے سو برسوں میں کوئی تحریک کیوں نہیں اٹھی یا حکام سے کوئی شکایت کیوں نہیں درج کرائی گئی؟

۷۔ اس حقیقت کا انکشاف آزادی کے بعد ہی کیوں ہوا؟ اور کیا ۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹ء سے قبل کوئی لوک کتھا یا لوک گیت ملتا ہے جو شہادت دے کہ یہ جگہ رام چندر جی کی جنم بھومی تھی؟

(روزنامہ قومی مورچہ بنارس منگل ۴؍مارچ ۱۹۸۶ء)

رام چندر جی اجودھیا میں پیدا ہی نہیں ہوئے

علم نجوم و ہیئت کے ماہرین، ہندو مذہب کی بنیادوں پر نظر رکھنے والے اور رفتار زمانہ کا تعین کر کے اس کرۂ ارض کی عمر ناپنے والوں کے مرتب کردہ اصول و ضوابط پر نگاہ ہو تو پھر یہ کہنا بڑا مضحکہ خیز ہے کہ شری رام چندر جی اجودھیا میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی پرستش اس مندر میں ہو سکتی ہے جس کو دو ہزار

سال قبل راجہ وکرمادتیہ نے بنوایا تھا اور بعد میں جس کو شہنشاہ بابر نے مسجد میں تبدیل کردیا۔ یہ معاملہ صرف تاریخی اور علمی حقائق کو ہی جھٹلانے کے برابر نہیں بلکہ ہندو مذہب میں "مقدس اوتار" یعنی بھگوان کے جنم لینے کا جو تصور ہے، اس کے بھی خلاف ہے۔ یہ کہنا کہ شری رام چندر جی اجودھیا میں پیدا ہوئے اس بنیادی تصور اور مذہبی عقیدے کے بھی خلاف ہے جس پر ہندو مذہب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔

(تفصیل کیلئے دیکھئے روزنامہ قومی مورچہ بنارس بدھ ۵ مارچ ۱۹۸۶ء)

اجودھیا

غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں کا متبرک مقام

اجودھیا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ یہاں حضرت آدمؑ تشریف لائے، ان کے نامور بیٹے حضرت شیثؑ کی یہاں قبر ہے، حضرت ایوب علیہ السلام اور انکی وہ بیوی جو بحالت مرض آپکے ساتھ تھیں، ان دونوں کے مزار یہیں مٹی پربت میں ہیں۔ حضرت نوحؑ کے تین بیٹے تھے جنھوں نے مختلف ملک بسائے ان میں ایک بیٹے ہند تھے، انکی قبر بھی اسی منی پربت کے احاطہ میں ہے جو نوگزی قبر سے مشہور ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان کا نام "ہند" انھیں کے نام پر پڑا ہے۔ بزرگان دین میں سے موسیٰ عاشقین کی خانقاہ اور حضرت جلال الدین گوتبری کے مزارات بھی یہیں ہیں۔ حضرت قاضی قدوۃ الدین جو خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر بھائی تھے اور جن کی اولاد قدوائی خاندان سے مشہور ہوئی، ان کا بھی مزار یہیں ہے۔ یہاں پر سیکڑوں علماء و صلحاء نے جام شہادت نوش کیا جن کا اجتماعی مدفن بابری مسجد کے قریب ہی ہے جو گنج شہیداں کے نام سے موسوم ہے۔ اس طرح اجودھیا کی سرزمین بہت بابرکت ہے۔

(روزنامہ قومی مورچہ بنارس ۲۳ جون ۱۹۸۶ء) (آئینہ دارالعلوم دیوبند ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء)

بھارت کے راجاؤں کی اجازت سے بابر بادشاہ بنا

بالا جی دیورس کو آدین شرما کا منہ توڑ جواب

ہندوستان صدیوں سے دو مورچوں پر لڑتا رہا ہے۔ سامراجیت اور فرقہ واریت سے لیکن آج کی تاریخ میں اس دیش کو اصلی خطرہ فرقہ واریت سے ہے، چاہے وہ ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی فرقہ واریت ہو۔ آزاد ہندوستان کی ایکتا کو ان ہی کٹر لوگوں سے خطرہ ہے۔ کیوں کہ اس دیش کی تاریخ کو فرقہ واریت نے بار بار لال کیا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں جس تیزی سے ہندو، سکھ یا مسلمان فرقہ واریت ابھری ہے، وہ ایک خطرناک اشارہ ہے۔ لیکن اکثریت کی فرقہ واریت ہمیشہ زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتی ہے۔ اکثریت کی فرقہ واریت، تاناشاہوں، ہتھیاروں اور ہٹلروں کو جنم دیتی ہے۔ جس کا انجام دیش کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ ہندو فرقہ پرست اتحاد یہاں عرصے سے سرگرم ہے، لیکن پچھلے کچھ مہینوں سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے مکھیا بالا صاحب دیورس جس زہر گھلی بھاشا کا استعمال کر رہے ہیں اسے سنجیدگی سے محسوس کرنا ہوگا۔ خاص طور پر دلی اور بمبئی میں ان کے بھاشن اشتعال انگیز تھے۔ بنگلور میں ان کے بھاشن کا لب لباب تھا کہ اکثریت کو بیٹانا بند کرو ورنہ دیش ڈوب جائے گا۔ دلی کا بھاشن بھی اسی لائن پر تھا۔ وہ ہندوؤں کیلئے آج کل کافی فکرمند ہیں، جیسے پانچویں دہائی میں انکے گرو گاندھی جی کی کارگذاریوں سے فکرمند تھے ـــ دیورس جی ماضی کی جھوٹی بناء کے سہارے ہندو سماج کو ورغلانا چاہتے ہیں۔ ان کی دلیلیں وہی ہیں، جو اندھے اعتقادی اور ناواقف مذہبی لیڈر سیکڑوں سال سے دیتے رہے ہیں کہ وہ اوروں سے افضل ہیں۔ اور ہماری فراخدلی کیوجہ سے باقی مذہب اور فرقے اس میں بیچ میں جبکہ اصلیت اس کے برعکس ہے۔ جب جب ہندو سماج میں دیورس جی جیسے لوگ حرکت میں آئے ہیں، سماج کا کوئی نہ کوئی حصہ اس سے

کافی دور رہتا ہے، آج سکھ ہم سے الگ ہیں تو اس کیلئے سکھ فرقہ واریت سے زیادہ ہندو فرقہ واریت ذمہ دار ہے۔ ۸۰ - ۱۹۸۵ء کے واقعات تو پچھلے ۲۵-۳۰ سالوں کے واقعات کا ردعمل تھے۔ دیورس جی اپنے بھاشنوں میں یہ کہنا بھول جاتے ہیں کہ بھارت پر مسلمانوں کے حملوں سے پہلے ہی ہندو سماج اپنی چھوٹی شان، کٹرپن اور بنیاد پرستی کے سبب بکھر چکا تھا۔ حملہ آوروں نے ان کو آکر آرام سے ٹھونک دیا۔ اس کے بعد بھی اس سماج نے خود کو وقت کے مطابق نہیں ڈھالا جس کی وجہ سے غریب اور استحصال شدہ طبقہ پہلے مسلمان بنتا گیا، پھر عیسائی۔ دیورس جی کو تبدیلی مذہب پر کافی تکلیف ہے لیکن وہ یہ نہیں بتلاتے کہ آخر آدی واسی غریب عیسائی مذہب کیوں قبول کرتا ہے یا ہریجن مسلمان کیوں بنتا ہے۔ آپ ان کو برابری کا درجہ دے نہیں سکتے۔ ذات پات سمیلنوں میں شرکت کرینگے اور جب اس کے ردعمل کے طور پر دوسرے مذہب کیطرف راغب ہوتے ہیں تب قومی ایکتا پر آنچ آنے لگتی ہے۔ لیکن بالا صاحب دیورس فرماتے ہیں کہ جب بھارت میں مسلمان اور عیسائی آئے تو ہم نے سب سہولتیں ان کو مہیا کیں، ایک دم مضحکہ خیز دلیل ہے۔ محمود غزنوی، محمد غوری یا علاءالدین خلجی کو کس نے اجازت دی تھی کہ ہندوستان پر حملہ کرو۔ طاقتور کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی، انگریزوں نے بھارت پر حکومت کرنیکی اجازت لی تھی؟ شاید ہم لوگوں نے ہی ہوڑوں کو، منگولوں کو، نادر شاہ کو اجازت دی تھی کہ آئیے لڑیں۔ جس دھرم کے ٹھیکیداروں نے مزدور طبقہ کو شودر بنایا ہو، ان سے کسی بھی دھرم یا دیش کی حفاظت کی امید کرنا بیوقوفی ہے۔ بالا صاحب دیورس اور ان کا گروہ ان ہی

ٹھیکیداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دراصل بالا صاحب دیورس تاریخ کا اپنے حساب سے مطالعہ کرتے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر دیورس جی سال دو سال ٹھنڈے دماغ سے تاریخ پڑھتے۔ وہ اسی تاریخ کی دہائی دے رہے ہیں جو تاریخ انگریزوں نے ہمیں جان بوجھ کر پڑھائی، مسلم تاریخ اور ہندو تاریخ، لیکن ہندوستان کی تاریخ غائب ہے۔ دیورس جی کو بھی یہی تاریخ بھاتی ہے کہ بھارت کا نقشہ چھوٹا ہو گیا، لیکن کس کی غلطی سے؟ جس عہد کو وہ ہندو عہد مانتے ہیں (آٹھویں صدی) عربوں نے اسی وقت سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ محمد بن قاسم کو سبھی پہلا حملہ آور مانتے ہیں لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ اسے سندھ کے راجہ سے ناخوش ہندوؤں نے ہی بلایا تھا۔ دیورس جی کو ابھی پڑھنا پڑے گا کہ شروع میں رانا سانگا نے بابر کے پاس خبر بھجوائی تھی کہ آپ آ گئے ہیں تو ابراہیم لودھی سے لڑیں۔ بابر نے لودھی کو ہرایا اور راجاؤں کی مدد لیکر بادشاہ بھی بن گیا۔ اسی طرح آر۔ ایس۔ ایس والے آج بھی پرتھوی راج چوہان اور جے چند کے قصے کو ایک دم الٹا بتلاتے ہیں۔

دراصل دیورس جی کی تاریخ چند بردائی پرستوں نے لکھی ہے اور اس سے بڑا فراڈ تاریخ میں آج تک نہیں لکھا گیا ہے۔ پرتھوی راج چوہان نے کس طرح نام نہاد پچھڑی ذاتیوں کے شورویروں کو مروایا، اس کا ذکر ان کے بھاشنوں میں نہیں ہوتا۔ محمود غزنوی کیا تھا؟ سومناتھ کا مندر کیوں لوٹا؟ کیا صرف اس لئے کہ غزنوی مسلمان تھا یا اس لئے کہ غزنوی لٹیرا تھا اور جہاں بھی سونا یا دولت ہوتی تھی، لوٹنے جاتا تھا۔ پھر سومناتھ مندر کی لوٹ کے وقت لوٹنے والا اکیلا غزنوی نہیں تھا، اس کے ساتھ سیکڑوں غیر مسلم ہندوستانی بھی تھے۔ محمد غوری بھی کوئی ایسا مذہبی لڑاکا یا حملہ آور نہیں تھا جو دھرم پھیلانے آیا تھا۔ وہ بھی لٹیروں کی فوج کا سردار تھا (بقول

دیورس جی) ہماری اجازت سے ہندوستان کا مالک بنا تھا۔ اگر وہ مذہبی جنگجو ہوتا تو غزنی میں محمود غزنوی کی راجدھانی اور مسجد نہ جلاتا۔ لیکن جن ہندو راجاؤں نے ہندو مندر توڑے، لوٹے، انھوں نے کس سے اجازت لی تھی ؟ ۱۱ویں صدی میں کشمیر کے راجہ ہرش نے مندروں کو توڑا، آسام میں وسنوؤں نے کرشن کے سبھی مندر توڑے تھے، اس کا ذکر کہیں نہیں ہوتا۔ دیورس بھی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اورنگ زیب نے اگر ہندوؤں پر جزیہ لگایا تھا تو مسلمانوں پر زکوٰۃ لگائی تھی۔ دونوں ٹیکس فوج کھڑی کرنے کیلئے تھے۔ رانا پرتاپ آج آر۔ ایس۔ ایس کیلئے ہندوستان کی اکھنڈتا کی علامت ہیں جبکہ وہ مغلوں سے اپنے راج کیلئے لڑ رہے تھے۔ ہلدی گھاٹی میں رانا پرتاپ کی فوج کا سپہ سالار مسلمان تھا اور اکبر کی فوج کا سپہ سالار راجپوت۔ رانا پرتاب کی فوج میں پٹھان بہت بڑی تعداد میں تھے تو اکبر کی فوج میں ہندو بڑی کثرت تھے۔ اورنگ زیب کو ہم نے مغل سلطنت کے سب سے بڑے مذہبی بادشاہ کے روپ میں اچھالا ہے لیکن اجین کے مہاکلیشور مندر کے رکھ رکھاؤ کا خرچ بھی وہی دیتا تھا۔ دیورس جی کو شاید پتہ نہیں کہ غزنوی کے جو سکے ملے ہیں ان پر سنسکرت میں کلمہ لکھا ہے۔ چتوڑ کے مینار پر اللہ کھدا ہوا ہے۔ اکبر نے جو سکے چلائے تھے ان پر رام سیا لکھا ہے ۔ دراصل بالا صاحب اور ان کے تاریخ داں دو راجاؤں کی لڑائی کو ہندو اور مسلمان کی لڑائی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر مسلمان راجاؤں کے یہاں گدی کیلئے جھگڑے ہوتے تھے تو ہندو راجاؤں کے یہاں بھی شیواجی کو مرہٹہ سردار بننے کیلئے پہلے سبھی مراٹھے راجاؤں کو ہرانا پڑا تھا۔ اگر بادشاہوں کے یہاں حرم تھے تو دوسری طرف

بھی ایسا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زنانخانے میں ۹۰ رانیاں تھیں۔ راجہ راجہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ یہ سچائی بھول جاتا ہے۔

شیواجی کو آج پورے ہندوستان میں ہندو دھرم کا مہان محافظ بتایا جا رہا ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ اورنگ زیب بادشاہ نہیں ہے، وہ دلی کی گدی سے ہٹے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مراٹھا راج پران کا قبضہ رہے تو وہ اورنگ زیب کو بادشاہ ماننے کو تیار ہیں۔ شیواجی کی فوج میں ہزاروں مسلمان تھے۔ خود اورنگ زیب کی فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر زیادہ تر راجپوت تھے۔ لیکن ظالم بادشاہوں کو مذہبی جنونی بادشاہ بتا کر دیورس صاحب اور انکے گروہ کے لوگ خوب واہ واہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ بالا صاحب دیورس یہ کسی کو کیوں نہیں بتاتے کہ ہندو سماج کے کٹرپن کی وجہ سے لوگ اس سے بھاگتے رہے ہیں۔

سکھ دھرم جو ہندو فلسفے کے فروغ کے رد عمل کا ایک حصہ ہے، وہ بھی ہم سے کٹ گیا۔ دیورس جی بھارت کے بدلتے نقشے پر بھی فکر مند ہیں لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ نقشہ کن لوگوں کی غلطیوں سے چھوٹا ہوا ہے، جب افغانستان اس دیش سے نکلا تھا تب اقلیت کو کون بٹا رہا تھا۔ اس وقت اگر اقلیت نہیں پٹائی جا رہی تھی تو نقشہ کیسے چھوٹا ہو گیا۔ دراصل ہندو دھرم کے ٹھیکیداروں کے دھرم اور فلسفہ کا علم صفر رہا ہے۔ آج جو ہندوستان ہے وہ نہ سکھ کا ہے، نہ ہندو کا، نہ مسلمان کا، نہ عیسائی کا۔ اس پر جتنا حق ہندو کا ہے اتنا ہی مسلمانوں کا ہے۔ فرقہ واریت اس دیش کو توڑتی ہے اور سیکولرازم اس دیش کو بچاتا ہے۔ دیش کو مہاتما گاندھی

بچاتے ہیں، آر۔ ایس۔ ایس توڑتا ہے ۔..... دیورس جی کو یہ تکلیف بھی ہے کہ اگر اقلیتوں کو ایسے ہی پٹایا گیا تو آگے چل کر تبدیلی مذہب کے سبب ہندو اقلیت بن جائیں گے۔ تو دیورس جی مردم شماری بڑھنے یا زیادہ بچے پیدا ہونے سے دھرم یا غیر ملکی دولت کا نہیں، غریبی کا رشتہ ہوتا ہے۔ سیدھا اصول ہے کہ جتنی زیادہ غریبی، اتنے زیادہ بچے۔ کس امیر ہندو یا امیر مسلمان کے ۱۰ بچے ہوتے ہیں؟ لیکن غریب ہندو یا مسلمان بچے بنانے کی مشین بن جاتا ہے۔

دیورس جی اور ان کے حمایتی فضول ہی ہندوؤں کے لئے پریشان ہیں۔ اس دیش میں آر۔ ایس۔ ایس رہے یا نہ رہے (ویسے بھی اگر ان کی بات ہندو عوام کو متوجہ کرتی تو یہ ٩٥٢ء میں ہی اقتدار میں آجاتے) لیکن دیورس جی ہندو اکثریت بھی رہے گی، دیش میں ڈیموکریسی بھی رہے گی اور ہندو آپ لوگوں کے رہتے بھی سیکولر رہے گا کیونکہ دیش اس دن ٹوٹ جائیگا جس دن ہم ہند دماغ سے سوچنے لگیں گے اور کٹر ذہنیت پر منحصر ہو جائیں گے تب بربادی کا راستہ طاقتور ہو جائیگا۔ دیش کا نقشہ اسی لئے چھوٹا ہوتا رہا ہے ۔

دیورس جی ہمیں کٹر اور بند خیالات بیچنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں دیش کو برقرار رکھنے کیلئے کھلے دماغ اور صحیح سوچ کی ضرورت ہے۔ اس تصور کو بالا صاحب کے یہ بھاشن اب بدل نہیں سکتے مگر ماحول کو زہریلا ضرور بنا سکتے ہیں۔ اس زہر کو پھیلنے سے روکنا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔

(ہفتہ وار نئی دنیا دہلی ۔ ۱۸ فروری ۱۹۸۶ء جلد ۱۴ شمارہ ۲۵)

آنکھوں دیکھا حال

معصوم مرادآبادی نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابری مسجد اجودھیا میں جو کچھ بچشم خود دیکھا ذیل میں اسکا اقتباس ملاحظہ ہو۔

ضلع فیض آباد سے صرف ۶ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع اجودھیا کی کل آبادی ۳۵ ہزار ہے جن میں تقریباً ایک ہزار مسلمان ہیں۔ آبادی کی اکثریت پنڈتوں سادھوؤں اور بیراگیوں پر مشتمل ہے جن کی کل تعداد ۲۲ ہزار ہے یہاں ۴ ہزار سے ویرانے مندر ہیں اور تقریباً ۱۰۰ قدیم مسجدیں ہیں جن میں چار بڑی مساجد بابر، شاہجہاں، عالمگیر اور شاہ عالم کے نام سے موسوم ہیں۔ ۷۲ قبرستان سرکاری اندراج میں ہیں جن میں صرف ۶ قبرستانوں میں مردے دفن کرنے کی اجازت ہے۔ مساجد زیادہ تر قدیم و خستہ ہیں جن کی مرمت و تعمیر کی اجازت نہیں اور نہ یہاں کوئی نئی مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے جبکہ مندروں کی تعمیر و مرمت پر کوئی پابندی نہیں۔ اجودھیا میں ایک لمبی ۹ گزی قبر حضرت شیثؑ کی بتائی جاتی ہے جس کی تصدیق کاغذات سے اور بعض معتبر کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ اجودھیا میں ۱۹۵۴ء سے اب تک دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے، اسی وقت سے ۱۵ کلومیٹر ایریا میں گوشت کی دوکان کھولنے پر پابندی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بابری مسجد سے ۱۵۰ کلومیٹر کے رقبہ میں مسلمانوں کا داخلہ ممنوع ہے جبکہ عدالت کا یہ حکم نہیں ہے۔ مسجد کے تین طرف شمال کو چھوڑ کر ہے، بگیہ قبرستان کی زمین ہے جس پر ۱۹۴۹ء کے بعد عمارتیں بن گئیں جن میں درشن کیلئے آنیوالے ٹھہرتے ہیں۔ مسجد کے

صدر دروازہ کے بائیں وشو ہندو پریشد کا بورڈ لگا ہوا ہے جہاں یکم فروری ۱۹۸۶ء سے تالا کھلنے کے بعد ہی سے بھجن کیرتن ہوتا ہے۔ وشو ہندو پریشد نے یہاں عالی شان مندر بنانے کیلئے ۲۵ کروڑ روپئے فراہم کرنیکا پروگرام بنایا ہے۔ مسجد کے صدر دروازہ پر ہندی میں رام جنم بھومی تحریر ہے، ہندی میں یہ بھی لکھا ہے کہ فوٹو لینا سخت منع ہے۔ یہاں سی آر پی کے تین مسلح جوان نگرانی کرکے اندر جانے والوں کو خالی ہاتھ ہی جانے دیتے ہیں۔ صدر دروازہ پر دو جگہ لفظ "اللہ" نمایاں انداز میں کھدا ہوا ہے۔ دروازہ کے باہر ہندی میں ایسی زہریلی کتابیں بھی بکتی ہیں جن سے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

صدر دروازہ کے اندر تقریباً چھ فٹ اونچا پختہ چبوترہ ہے جس پر پتھر کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں نصب ہیں۔ یہی متنازع رام جنم استھان ہے۔ چبوترہ کے حدود کا حصہ ۱۹۴۹ء سے ہی تالا لگنے کے بعد مندر کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور یہیں سے مسجد کے اندر رکھی ہوئی مورتیوں کے درشن بھی لوہے کی سلاخوں والے دروازہ سے ہوتے تھے۔ چھوٹے دروازہ سے مسجد کے اندر مورتی کے پاس جانیکی اجازت صرف پجاری کو تھی دوسرے کو عدالت کی طرف سے اجازت نہ تھی۔ چبوترہ پر اور اس کے حدود میں سیکڑوں پتھر مختلف ناموں کے لگے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۹ء کے بعد مقدمہ لڑنے اور مندر بنانے کیلئے کثیر رقمیں فراہم کی ہیں۔ احاطہ میں صدر دروازہ سے لگی ہوئی لکڑی کی بنی ایک لمبی کوٹھری ہے جس میں پجاریوں کا سامان اور گنگا جل رکھا رہتا ہے، احاطہ میں صحن مسجد سے متصل دائیں جانب فریم کی ہوئی

چند مورتیاں رکھی ہیں اس مقام کو سیتا رسوئی کہا جاتا ہے۔ یہیں مسجد کا ایک دوسرا دروازہ ہے۔ چبوترہ کی مورتیوں کی طرف توجہ کم ہے۔ مسجد میں رکھی مورتیوں کے درشن کیلئے تانتا بندھا رہتا ہے۔ چبوترہ کے حدود میں ایک تخت پر ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء سے رات دن پانچ چھ لوگ اکھنڈ کیرتن کرتے رہتے ہیں انکا کہنا ہے کہ مسجد توڑ کر جب تک مندر نہیں بنے گی یہ کیرتن چلتا رہے گا اگر کیرتن بند ہو گیا تو مسلمان حملہ کر کے اپنا قبضہ کر لیں گے، ان لوگوں نے دروازے سے متصل مورتیاں بھی نصب کی ہیں۔ رام جنم بھومی مکتی سیوا سمیتی کے ۵۴ ملازم ہیں ۴۲ کیرتن کے لئے باقی لوگ روپئے کی فراہمی کیلئے سیوا سمیتی کی دولت کا حساب کتاب کسی کو معلوم نہیں۔ تعمیر کرنے کیلئے اب تک سوا کروڑ روپئے اکٹھا کیا گیا ہے۔ مندر کی تعمیر میں کیا مشکلات ہیں اس کو بیراگی نے بتلایا کہ ابھی اس کا تنازعہ چل رہا ہے اور پورے دیش میں مسلمانوں نے شور مچا رکھا ہے۔ حکومت مسلمانوں کو چھوٹ دے رہی ہے مندر بنانا اتنا آسان نہیں ہے۔ صحن مسجد میں داخلہ کے دروازہ پر بھی سی آر پی کا ایک مسلح جوان تعینات ہے۔ صحن میں داخل ہوتے ہی تین گنبدوں پر مشتمل مسجد کے اندرونی حصہ کی پیشانی پر فارسی میں تین اشعار کندہ ہیں جن میں مسجد کی تاریخ تعمیر درج ہے۔ ان اشعار کے دونوں جانب گول دائرے میں ابھرے ہوئے لفظ میں "اللہ" کندہ ہے۔ صحن کے بائیں خستہ حالت میں ایک زینہ ہے جو لکڑی کے ٹٹے سے بند ہے۔ مسجد کی خستہ دیوار میں پودے اگ آئے ہیں جو درخت کی شکل اختیار کر کے عمارت کو کمزور کر رہے ہیں۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں سفید پتھر کی

جانمازیں بچی ہیں، اندر تین صفیں ہیں اور صحنِ مسجد میں چار صفیں اور ہر ایک صف میں ۱۲۰ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

درمیانی گنبد کے نیچے پتھر کی ایک مورتی رکھی ہوئی ہے اور شیشے کے فریموں میں رام چندر، ہنومان اور گنیش وغیرہ کی تصویریں رکھی ہوئی ہیں۔ منبر کے تیسرے زینے کے اوپر ہنومان کا مجسمہ نصب ہے، مورتیوں کو لال کپڑے سے ڈھک دیا گیا ہے۔ سات فیٹ کی دوری سے درشن کرنیوالے ہاتھ جوڑ کر درشن کرتے ہیں یہاں لکڑی کے ہاتھ سے حد بندی ہے اور دان کرنے کے لئے لکڑی کا ایک صندوق ہے جس کے دائیں ایک پجاری درشن کرنے والوں کو ایک ایک چمچہ گنگا جل دیتا ہے یہاں بھی سی آر پی کا ایک مسلح جوان رہتا ہے۔ درمیانی گنبد کے حصہ میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب دیوار پر ہنومان کی تصویر پینٹ کی گئی ہے اسی طرح بائیں گنبد کی دو دیواروں پر شہید بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کی تصویریں پینٹ ہیں۔ اندرونی دیواروں پر کوئلے سے کچھ لکھا تھا جو صاف ہے۔ دائیں جانب تیسرے گنبد کے نیچے بھی فریم شدہ چند تصویریں رکھی ہیں۔ صحنِ مسجد میں بندر آزادانہ ٹہلتے ہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے سے روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک درشن کرنیوالے آتے ہیں۔ مسجد کے پیچھے بھی سی آر پی کے مسلح جوان پہرہ دیتے ہیں۔ مسجد کی سالہا سال سے مرمت نہ ہو سکنے کی وجہ سے خستہ حالت ہے۔ مسجد کے تین جانب صوبائی حکومت کیطرف سے لاکھوں روپئے کے خرچ سے سیمنٹ کے پلروں اور

لوہے کے پائپوں سے ہالہ بنایا جا رہا ہے تاکہ مسجد کسی امکانی خطرے یا حملے سے محفوظ رہے مگر یہ کوئی معنی رکھتا ہے کہ خستہ مسجد کی مرمت نہیں کی جاتی اور اس کی حفاظت کیلئے ہالہ پر لاکھوں روپئے صرف کئے جا رہے ہیں۔

اس محکمہ نے یہاں رام جنم استھان کا بورڈ بھی لگا دیا تھا جسے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے احتجاج پر ہٹا لیا گیا، کہا جاتا ہے کہ صوبائی حکومت نے اجودھیا کو خوبصورت اور ہندوؤں کا مقدس مذہبی مقام بنانے کیلئے ۵۰ کروڑ روپئے کی رقم مخصوص کی ہے۔

معصوم مراد آبادی اجودھیا کے محلہ قربانہ میں ۸۰ سالہ حاجی عبدالغفار صاحب سے بھی ملے جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء تک بابری مسجد کے امام تھے ان کے والد مولوی عبدالقادر صاحب ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء تک امام تھے اور ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء تک حاجی عبدالغفار کے ماموں حاجی عبدالرشید صاحب منصب امامت پر فائز رہے۔ اجودھیا میں کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندوؤں کی قدیم ترین تہذیب کے نشانات مل جائیں اس لئے ۱۹۷۶ء و ۱۹۸۰ء کے درمیان بابری مسجد کی بنیادوں اور اجودھیا کے دوسرے مقامات کی کھدائی کی گئی تاکہ رام چندرجی کے عہد کے کچھ آثار برآمد ہو جائیں مگر اس میں سخت مایوسی ہوئی اس کے برخلاف مسلمانوں کی قدیم ترین آبادی کے نشانات ملنے لگے جن کو انتہائی خاموشی سے غائب کر دیا گیا۔ اس کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ اجودھیا قدیم ترین زمانے سے مسلمانوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں

سیکڑوں بزرگ آسودۂ خواب ہیں جنھوں نے تبلیغ اسلام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ اس لئے یہ ایک مسجد کی بازیابی ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی پرانی تاریخ و تہذیب اور ان کے تشخص کی بقا کا مسئلہ ہے (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی ۱۷؍فروری ۱۹۸۶ء)

متفرقات

سید صباح الدین مدیر ماہنامہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ نے "بابری مسجد" کے نام سے ایک مستند کتاب لکھی ہے ذیل میں اس کے متفرق اقتباس و تلخیص ملاحظہ ہوں۔

فیض آباد نوابان اودھ کا دار السلطنت تھا اور مسلمانوں کا شہر سمجھا جاتا تھا، اجودھیا اسی کا ایک حصہ ہے جس سے مسلمانوں کا تعلق عقیدت مندانہ ہے، یہاں حضرت شیث کی قبر ہے، اس کے بڑے احاطہ میں بہت سے بزرگان دین مدفون ہیں۔ حضرت نوح، حضرت مندین نوح، حضرت ایوب اور انکی اہلیہ کی بھی قبریں ہیں۔ یہاں نختی بابا، لعل شاہ باز قلندر، جنگی شہید، الٰہی بخش مجذوب، علم بخش، شاہ مدار، سید جلال الدین خراسانی، شاہ ثمن فریاد رس، حضرت جمال الدین، شاہ ابراہیم، شاہ جیت، قاضی قدوہ، سلطان موسیٰ عاشقان، شاہ علی اکبر میر کشادی، بہادر شاہ، مکن شاہ، قطب شاہ، شاہ بدیع الدین، حضرت جلال الدین اور سید سالار مسعود غازی کے شہید مجاہدین کی بھی قبریں ہیں۔ خواجہ

نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ نصیر الدین چراغ اودھی ثم دہلویؒ کا خاندان بھی یہاں آباد ہوا۔ ۱۸۸۱ء کے گزیٹر میں یہاں چھتیس مسجدیں مذکور ہیں، مسجد سرگدواری اتنی بلند ہے کہ کوسوں دور سے نظر آتی ہے ۔

اجودھیا بودھ مذہب کا بھی مرکز تھا، ان کے بیس مندر تھے اور تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے یہاں گوتم بدھ نو یا انیس برس تک رہے، اب بودھ مذہب کے آثار سب ختم ہو گئے یہ شہر جین مت کے پانچ پیشواؤں کا بھی مولد و مسکن رہا یہاں ان کے بھی مندر تھے ۔ ہندوؤں کا بھی بہت پوتر شہر ہے ان کے خیال میں یہاں رام چندر جی پیدا ہوئے، حکومت کی اور مرنے پر جلائے گئے ۔ اجودھیا میں یہ کشمکش ہے کہ یہاں ہر مذہب کے پیشوا کھینچ کر آئے اس لئے اس کی مذہبی تاریخیت باقی رہنی چاہئے، صرف ایک مذہب سے وابستہ کر کے اس کی خصوصی حیثیت کو پامال کرنا درست نہیں ۔ وزیر اتر پردیش پنڈت لوک پتی ترپاٹھی کا بیان ہے کہ اجودھیا کا کوئی وجود نہیں ۔ تلسی داس کی رامائن میں ہے کہ اجودھیا سرجو ندی میں ڈوب گیا تھا ۔ آج کا اجودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کیا ہوا ہے ۔ رام جنم بھومی تحریک امریکہ میں شروع ہوئی اس کے نتیجہ میں رتھ یاترا نکالی گئی ۔ سی آئی ۔ اے ہندو مسلم تعلقات بگاڑنے کے لئے اجودھیا میں شرارت کر رہی ہے ۔ ایسے ہی وچار بودھ ہندی دینک پٹنہ میں شائع ہوا کہ اودھ کے مسلمان کو لڑانے کیلئے انگریزوں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعہ کو جنم دیا ۔ انگریزوں نے

مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کیلئے یہ پرچار کیا کہ انھوں نے دوسروں کی عبادتگاہیں مسمار کیں حالانکہ عیسائیت کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے خود ایک عیسائی مورخ ایس۔ پی اسکاٹ لکھتا ہے کہ سسلی میں مسلمانوں کے ہزاروں محل اور مسجدیں کلیسا کے تعصب کی نذر ہوگئیں اب وہاں ایک بھی باقی نہیں۔ اسپین کی ہزاروں مسجدوں کو عیسائیوں نے مسمار کرکے وہاں کلیسا یا مکانات بنا لئے۔ صلیبی جنگ کے زمانہ میں صلیبیوں نے انتہائی بے دردی سے یروشلم کی مسجدیں منہدم کیں۔ بقول یورپین مورخ ایڈورڈ اٹھارہویں صدی کے وسط میں ترکوں کے خلاف کریمیا کی جنگ میں روسیوں نے چھ ہزار مکانات اور اڑتیس ۳۸ مسجدیں جلادیں۔۔۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدیں جلادیں سے۔ مسلمانوں کی مستند کتابوں میں یہ تفصیل موجود ہے کہ ہندوؤں نے خود مسلمانوں کے دور عروج میں کتنی مسجدیں شہید کیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سرکاری رپورٹ سے ثابت ہے کہ مسلمان بے شمار مسجدوں سے بے دخل کر دیئے گئے۔ ۹۷۶ھ میں رام راج نے علی عادل شاہ کے قلمرو کی تمام مسجدیں جلادیں۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں ست نامیوں نے نارنول کو لوٹ کر اس کی تمام مسجدیں منہدم کر دیں۔ بہادر شاہ اول کے بعد جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھپور کی مسجدیں شہید کرکے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے۔ اجودھیا میں ہندوؤں نے تین مسجدیں مسمار کر دیں۔

سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں ہزاروں مسجدیں برباد کیں۔ ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند کی مقرر کردہ برنی کمیٹی کی رپوٹ سے صرف دہلی کی تقریباً ۱۷۶ مسجدوں سے مسلمان محروم تھے، ان پر ہندوؤں یا حکومت کا قبضہ تھا اور اب تک واگذاشت نہیں ہوئیں۔ صرف کلکتہ میں ۵۹ مسجدوں پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں ص۱۴۵۔

مغل دور حکومت میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد تنازعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مغل حکومت کمزور ہوئی تو اودھ میں نوابوں کی حکومت قائم ہوئی جب یہ بے جان ہوئی تو انگریزوں نے اپنا تسلط جمانا شروع کیا وہ مسلمانوں سے حکومت چھین رہے تھے اس لیے ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ۱۸۵۵ء میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا جھگڑا کھڑا کیا۔ ہندوؤں کو ورغلایا کہ اجودھیا کی زیادہ تر مسجدیں مندروں کو توڑ کر یا ان کی کسی پوتر جگہ پر بنائی گئی ہیں ص۱۵۔ اجودھیا کے بیراگیوں نے انگریزوں کے زیر سایہ تین چار مسجدوں کو شہید کر لیا تھا تو ان کے حوصلے بابری مسجد پر قبضہ کرنے کیلئے کیوں نہ بڑھتے، وہ اس کے اندر ہوم کر چکے تھے، سنکھ بجا چکے تھے اور موہن بھوگ بھی کھا چکے تھے اب اس کو توڑ کر مٹا دینا یا مندر میں منتقل کرنا باقی رہ گیا تھا مگر اجودھیا کے مسلمانوں نے اپنی پسپائی اور قتل عام کے باوجود مسجد کو بیراگیوں سے خالی کرایا ص۲۶۔

جھگڑے کی وجہ سے احتیاطاً ۱۸۶۰ء میں یہ مسجد باضابطہ رجسٹرڈ کرالی گئی اور ۱۸۶۰ء کے مثل بندرجسٹرار کے یہاں یہ بابری مسجد کی حیثیت سے درج ہے ص۳۱ یکم نومبر ۱۸۶۰ء میں میر رجب علی خطیب بابری مسجد نے ایک درخواست دی کہ اقبال سنگھ نے ملحقہ بابری میں قاضی قدوہ کی قبر کے پاس زبردستی ایک چبوترہ بنالیاہے اور بڑھاتا جاتا ہے، منع کرنے پر آمادۂ ہنگامہ وتکرار ہوتاہے... اور اذان کے وقت سنکھ بجاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا، چبوترہ نیاہے یہاں کبھی نہ تھا، منہدم فرمادیا جائے، ہم غریب مدعی علیہ سے نجات پائیں۔ اس پر ۱۸ مارچ ۱۸۶۱ء کو عدالت نے اقبال سنگھ کو فہمائش کی کہ تاصدور حکم ثانی جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر نہ بنیاد جدید ڈالے نہ چبوترہ بڑھائے، اگر وہ نہ مانے اور بڑھائے تو اس کو چبوترہ سے اٹھادیا جائے یا اس کٹیا سے اٹھادیا جائے جس میں چار مہینہ سے بنا کر رہتا ہے ص۳۳ یعنی عدالت نے نیا چبوترہ اور نئی کٹیا ہٹانے کا فیصلہ نہ کرکے جھگڑے کو ختم نہیں کیا بلکہ یہ فیصلہ کیا کہ جو کٹیا اور چبوترہ بن گیا ہے اس میں مزید اضافہ نہ کیا جائے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی جو پالیسی اختیار کی ذیل میں اس کی ایک جھلکی ملاحظہ ہو۔

لارڈ ایلگن کے زمانہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ وڈ نے اس کو ۳ مارچ ۱۸۶۲ء کو لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کررکھا ہے، کہ ہم ہندو مسلمان کو ایک دوسرے

کا مخالف بناتے رہے، اس کو جاری رکھنا چاہئے، جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔ ۹ رمئی ۱۸۶۲ء کو اس نے پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لئے قابل اعتنا ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔ ۲۹ رمارچ ۱۸۸۶ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہلٹن نے لارڈ کرزن کو لکھا کہ ہم لوگ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیں کہ دونوں کے خیالات مختلف ہوں، اس لئے نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔ ۴ر جنوری ۱۸۸۶ء کو اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ ڈفرن کو لکھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی اختلاف پیدا کرنا ہمارے فائدہ کے لئے ہے، آپ نے ہندوستان میں نصاب تعلیم بنانے کے لئے جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں ص۳۳۔

اگر بابری مسجد کا قضیہ اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ مسلمان اپنے دور حکومت میں صرف مندروں کو منہدم کرتے رہے تو پھر یہ لکھنے میں بالکل باک نہیں کہ ہندوستانی سیاست والوں کا نہیں بلکہ مورخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ جائزہ لے کہ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اس وقت سے ابتک مسلمانوں نے کتنے مندر منہدم کئے اور ہندوؤں

نے کتنی مسجدیں شہید کیں، دونوں کے اعداد و شمار سے یہ فیصلہ ہو جائیگا کہ کون زیادہ قصوروار ہے۔ اب تو صاف اور غیر متعصب ذہن رکھنے والے ہندو مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں جو مندر منہدم کئے گئے وہ یا تو سرکشی کے مرکز یا معصیت کے اڈے تھے صـ۱۴۲۔

اگر ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں میں مندر شکنی کا جذبہ ہوتا تو وہ اپنے طویل دور حکومت میں ہندوستان کے تمام مندروں کو منہدم کرا دیتے۔ یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے غیر مسلم خاندانوں نے برضا و رغبت مذہب اسلام کو قبول کیا، اسلام لانے کے بعد عبادت کرنے کیلئے انکو مسجدوں کی ضرورت پڑی اور اب ان کے جو ذاتی اور خاندانی مندر تھے وہ بے کار ہو گئے اس لئے انھوں نے اپنے مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کر کے ان میں نماز و عبادت کا مشغلہ اختیار کیا (مرتب)

آخر میں لکھنؤ کی ریاستی حکومت اور دلی کی مرکزی حکومت سے کہنا ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے وطن دوستی اور وطن دشمنی، قومی یکجہتی اور قومی پراگندگی، خیر اندیشی اور بد اندیشی میں تفریق کرے اور اسمبلی و پارلیمنٹ کے منتخب مسلم ممبران نے بابری مسجد سے متعلق صوبائی و مرکزی حکومت کو جو میمورنڈم پیش کیا ہے اس کے پیش نظر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے مدبرانہ و منصفانہ فیصلہ کرے صـ۱۵۶۔

بابری مسجد کی مظلومیت کی

کہانی محمد ہاشم انصاری کی زبانی

بابری مسجد گھر سے نزدیک ہونے کی بنا پر میں اکثر اس میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی شب میں مسجد میں مورتیاں رکھنے سے ایک ماہ قبل ہنگامہ آرائی کی کیفیت شروع ہوئی۔ بڑی تعداد میں ہندو جمع ہونے لگے، یہ دیکھ کر مسلمان زیادہ تعداد میں مسجد میں نماز ادا کرنے جانے لگے، سٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر نے پابندی لگادی کہ صرف ۵۰ مسلمان نماز ادا کرنے جائیں۔ مسلمانوں نے یہ حکم نہیں مانا اور ڈیڑھ دو سو کی تعداد میں نماز ادا کرتے رہے۔ ۲۲ر دسمبر ۴۹ء کو آخری نماز عشاء پڑھ کر آئے، اسی رات میں اچانک مسجد کے اندر مورتیاں رکھدی گئیں۔ جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے گئے تو ان کو مسجد میں نہیں جانے دیا گیا، مسجد کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، اس اطلاع پر ہزاروں مسلمان جمع ہو گئے مگر پولیس نے کسی کو اندر نہیں جانے دیا۔ ہم نے حکومت کو نوٹس دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا سراسر زیادتی ہے اس لئے ہم اس حکم کے خلاف مسجد میں نماز الوداع ادا کریں گے۔ اس نوٹس کے بعد مسجد سے ڈیڑھ سو گز کی

دوری پر مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا۔ سولہ سو ملٹری اور چودہ مجسٹریٹ بلا لئے گئے۔ ۲۸ رمئی ۱۹۵۴ء کو احتجاج کرتے ہوئے تقریباً ۱۰۰ مسلمانوں نے نماز الوداع پڑھنے کی کوشش کی مگر ہمیں ڈیڑھ سو گز کی دوری پر گرفتار کر کے بری طرح مارا پیٹا گیا۔ ہم پر ۵۰۰ روپئے جرمانہ اور چھ مہینہ کی سزا مقرر کی گئی، جرمانہ وصول نہ ہونے کی صورت میں ہم سب کے گھر قرق کر لئے گئے اور میرے بھائی کا بھی گھر قرق ہوا، ہم لوگوں کو بستی، گونڈہ، فیض آباد اور بریلی کے جیلوں میں رکھا گیا۔ ہماری گرفتاری کے خلاف اپیل دائر کی گئی جس سے سزا گھٹا کر ۲ ماہ اور جرمانہ ۵۰ روپئے کر دیا گیا۔ ایک ماہ ۲۸ دن کے بعد ہم لوگ رہا کر دیئے گئے۔ بابری مسجد کے دو مقدمے میں مجھے فریق بنایا گیا ہے۔

محمد ہاشم انصاری محلہ صدر، اجودھیا، فیض آباد (یوپی)

(ملخص از ہفتہ وار نئی دنیا دہلی مارچ ۱۹۸۷ء جلد ۱۵ شمارہ ۳۸)

مسجد کا حکم

بابری مسجد سے متعلق طرح طرح کے دل آزار بیانات اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں کہ مسلمان مسجد کے بدلے دس گنا زمین لے کر بابری مسجد چھوڑ دیں یا اس کے بدلے معقول رقم لے لیں، کوئی کہتا ہے کہ اس کو قومی یادگار بنا دیا جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ مسجد کا شرعی حکم واضح کر دیا جائے تاکہ اس قسم کی تجویزوں کی نامعقولیت پورے طور پر واضح ہو جائے۔ ذیل میں تعمیر مسجد کے کچھ شرائط و ضوابط ملاحظہ کیجئے۔

غاصبانہ زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں، اگر بنالی گئی تو وہ توڑ دی جائے۔ رضائے الٰہی کے علاوہ ریاء و نمود یا کسی فاسد غرض کیلئے یا حرام مال سے جو مسجد بنائی جائے وہ مسجد ضرار یعنی منافقوں کی مسجد ہے مسلمانوں کی نہیں (عالمگیری) بیع فاسد سے لی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہیں (فتح قدیر) ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد بنانا درست نہیں اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہیں (عالمگیری) مشترک زمین پر بغیر شرکاء کی اجازت کے مسجد بنانا جائز نہیں اگر بنا دی جائے تو اس میں نماز نہ پڑھی جائے، اس نماز کا نہ ثواب ملے گا اور نہ اس کو مسجد تسلیم کیا جائے گا (مجموعہ فتاوی عبدالحی)۔

ان شرائط کے پیش نظر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بابری مسجد

ایک مندر منہدم کر کے اس کی زمین پر بنائی گئی ہے۔ اب آگے کی سطروں میں مسجد کا حکم ملاحظہ ہو۔

جو بھی مسجد ایکبار بقاعدۂ شرعیہ مسجد بنادی گئی اور اس میں نماز باجماعت پڑھی جانے لگی تو وہ وقف اور خانۂ خدا ہو گئی، کسی کی ملکیت نہیں، قیامت تک کے لئے مسجد ہو گئی، نہ اس کو بیچا جاسکتا ہے نہ کسی سامان و زمین کے عوض بدلا جاسکتا ہے، مسجد کی تھوڑی سی زمین بھی مسجد سے الگ کر کے دوسرے کام میں نہیں لائی جاسکتی۔ اگر مسجد شروع میں اس طرح بنی ہے کہ نیچے دوکان یا وضو خانہ اور اوپر کمرے نہ ہوں تو اوپر آسمان تک اور نیچے تحت الثریٰ تک مسجد کے تابع اور مسجد کے حکم میں ہے۔ مسجد ہی کی طرح اس کا احترام بھی ضروری ہے۔

جو زمین مسجد کیلئے وقف ہے اس پر سوائے مصالح مسجد کے اور کوئی تصرف جائز نہیں (کفایت المفتی ص۱۰۸ ج۷) جو مسجد بقاعدہ شرعیہ ایک مرتبہ مسجد بنادی گئی اور اس میں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ہو گئی اور آگر اس کو کوئی شخص اپنی ملکیت بتائے یا ملکیت جیسے معاملات کرے دوسرے مسلمانوں کو روکے تو یہ سب ناجائز اور ظلم ہے اس مسجد میں مسلمان کو نماز پڑھنا اور نماز کیلئے کھلا رکھنے کی سعی کرنا چاہئے (کفایت المفتی ص۱۲۰ ج۷)



کتب مجموعہ لقف ج

حیات طاہر :- مولانا محمد طاہر معروفی کے مفصل حالات زندگی 00-5

ایک عالمی تاریخ :- دنیا بھر کی تاریخی معلومات کا مجموعہ 00-6

تذکرۃ الفنون :- مدارس اسلامیہ میں مروجہ علوم کی یکجا تاریخ 00-5

حالات المصنفین :- تمام نصابوں کے مصنفین کتب کا مکمل تذکرہ 00-10

تاریخ وقائع الثانی :- تاریخ اسلام کا ترجمہ برائے امتحان مولوی 00-3

مشاہیر پورہ معروف :- بزرگان پورہ معروف کا مستند تذکرہ 50-2

مشاہیر کوپاگنج :- اکابر کوپاگنج کا مستند تذکرہ 00-10

گلدستہ فاخرہ :- منتخب نعتوں اور نظموں کا مجموعہ 50-1

ملنے کے پتے